مولانا ابوالکلام آزاد کے "ترجمان القرآن" کی دونوں جلدیں مبتیس ۳۲ روپیہ پیشگی بھیجکر آپ دفتر نگار سے حاصل کر سکتے ہیں۔ منیجر

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپکا چندہ مئی میں ختم ہو گیا اور جون کا پرچہ نو روپیہ ۵۶ پیسے میں وی پی روانہ ہوگا۔

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۰ | فہرست مضامین مئی ۱۹۵۹ء | شمار ۵

ملاحظات۔ (گرانی اشیاء اور افراطِ زر) ۔۔۔ ۳
فلاسفہ کا تصورِ الٰہ ۔۔۔ نواب محمد عباس طالب صفوی ۔ ۷
چند دن وادی دجلہ و فرات اور سرزمین قلوبارہ میں ۔۔ خواجہ احمد فاروقی ۔ ۹
نساخ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی روشنی میں ۔۔ سید مقبول الحسن ۔ ۱۴
ادب اور ارتفاع ۔۔۔ سید شبیر الحسن نونہروی ۔۔۔ ۱۹
آرام گاہ بیدل ۔۔۔ ڈاکٹر عبدالغنی ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ ۲۹
آزاد (ایک صحافی) ۔۔۔ عابد رضا بیدار ۔۔۔ ۳۵
باب الاستفسار (اثر لکھنوی کے دو شعر) ۔۔۔ ۴۰
باب المراسلہ والمناظرہ (کیا اقبال کا یہ شعر مہمل ہے) ۔۔۔ ۴۴
منظومات :- فیض احمد فیض ۔ کیفی چریاکوٹی مرحوم ۴۹
ادیب سہارنپوری ۔ شفقت کاظمی
سعادت نظیر ۔ شفیق بینائی
رعنا بسوی
مطبوعات موصولہ ۔۔۔ ۵۴

ملاحظات

گرانی اشیاء اور افراطِ زر

تقسیم ہند کو گیارہ سال کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اور اس دوران میں ہندوستان و پاکستان دونوں نے کچھ ترقیاں بھی کی ہیں۔ لیکن ان ترقیوں سے عوام کو کہاں فایدہ پہونچا اور وہ کس حد تک ان ترقیوں سے مطمئن ہیں، بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔

عوام و خواص کی ذہنیتوں میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔ خواص کے سامنے مستقبل ہوتا ہے اور عوام کے سامنے حال۔ خواص یہ سوچتے ہیں کہ حال کی تعمیر اس طرح ہونا چاہئے کہ مستقبل میں زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھایا جاسکے اور عوام کے سامنے صرف یہ سوال ہوتا ہے کہ

چہ خورد بامداد فرزند م

یعنی یہ صرف حال کو دیکھتے ہیں اور مستقبل پر ان کی نگاہ نہیں ہوتی۔ پھر اگر عوام حال کی طرف سے مطمئن ہیں تو جدھر چاہے انھیں موڑ دیجئے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر "وعدۂ فردا" کا اعتبار ان کے دلوں سے اٹھ جاتا ہے۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں، اُدھار کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں، ان کے یہاں اب ہے اور آرام، عافیت کی خبر وہ خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔

انسانی ضروریات زندگی میں سب سے پہلا سوال فراہمی غذا کا ہے، جس سے مراد غلہ، ترکاری، دودھ اور گوشت کا ہے۔ خیر گوشت کو چھوڑئے کہ وہ ایسی ضروری چیز نہیں اور عوام اس کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں، لیکن غلہ و ترکاری ایسی چیز ہے کہ وہ امیر و غریب سب کے لئے

"نگار" کا پاکستانی اڈیشن

تقسیم ہند کے بعد احباب "نگار" بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے اور اکثر سلسلۂ خریداری جاری نہ رکھ سکے بعض اس لئے کہ وہ پریشانیوں میں مبتلا تھے اور بعض اس لئے کہ ترسیلِ زر کی کوئی صورت نہ تھی۔ پنجاب، سندھ اور صوبۂ سرحد کے قدیم خریدار بھی اسی لئے گم ہو گئے کہ وہ چندہ نہ بھیج سکتے تھے۔ تاہم نگار برستور پاکستان بھیجا جا رہا ہے اور کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچ جاتا ہے۔

لیکن بہ صورتِ حال نہ پاکستان کے خریدارانِ نگار کے لئے قابلِ اطمینان ہے اور نہ ہمارے لئے، اسی لئے میں کچھ عرصہ سے سوچ رہا ہوں کہ:-

"نگار" کا ایک اڈیشن لاہور یا کراچی سے بھی شائع کیا جائے

میرا اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ نگار کی ایک زائد کاپی لکھوا کر ہر ماہ بھیجتا رہوں اور وہاں وہ شائع ہوتا رہے۔ فرق صرف اتنا پڑے گا کہ نگار یہاں ہر ماہ کی ۷ کو شائع ہوتا ہے، وہاں ۲۰ تک شائع ہوسکے گا۔

اس ادارہ کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ وہاں ڈکلریشن داخل کرکے اشاعت کی اجازت حاصل کی جائے اور پھر کسی مناسب جگہ دفتر قایم کرکے اس کام کو باقاعدہ شروع کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ میں اس سے خود کوئی مالی فایدہ نہیں اٹھاؤں گا، لیکن اس سے یہ ضرور ہوگا کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اسکے سننے والوں کی تعداد وہاں بڑھ جائے گی اور خدمتِ ادب کا دائرہ زیادہ وسیع ہوجائے گا۔

میرے اس خیال نے ابھی تک کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی ہے، نہ ایسا ہونا ممکن ہے جب تک کوئی صاحب یہ تمام دردِ سر مول لینے کے لئے طیار نہ ہوں۔ میرے لئے تو نہیں لیکن جو صاحب وہاں ذمہ داری اپنے سر لیں گے ان کے سامنے سود و زیاں کا سوال بھی ضرور آئے گا۔ اس کے لئے جو صاحب آمادہ ہوں انھیں تمام پہلوؤں پر غور کر لینا چاہئے، کیونکہ یہ بالکل میرے مزاج کے خلاف ہے کہ کسی کام کو شروع کیا جائے اور اسے ناتمام چھوڑ دیا جائے۔

اگر کسی ادارہ نے یہ ذمہ داری قبول کرلی تو اور زیادہ قابلِ اطمینان بات ہوگی کیونکہ وہ نگار کے علاوہ مطبوعات نگار بھی شایع کرکے فایدہ اٹھا سکے گا۔

میری اس تحریک کا ردِ عمل وہاں کیا ہوگا؟ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس باب میں مجھ سے ہر وقت مراسلت کی جاسکتی ہے۔

نیاز

قارئین "نگار" کے لئے چند ضروری اطلاعات

۱- "نگار" کا سالانہ چندہ اب نو روپیہ ۹۰ پیسے ہے، جس میں ۵ پیسے مصارف رجسٹری سالنامہ بھی شامل ہیں۔

۲- نگار ذریعہ وی، پی طلب کرنے میں آپ کو کافی نقصان ہوگا کیونکہ جدید قاعدہ کی رو سے اب محصول ڈاک میں جو اضافہ ہوا ہے اسکے پیش نظر آپ کو وی، پی دس روپے ۲۱ پیسے میں وصول ہوگا (سالانہ چندہ ۹ روپیہ ۵۰ پیسے، مصارف رجسٹری و وی پی ۵۶ پیسے فیس منی آرڈر ۵ پیسے) لیکن اگر آپ سالانہ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجا تو آپ کے صرف ۹ روپیہ ۶۵ پیسے خرچ ہوں گے اور اس طرح آپکو ۵۶ پیسے کی بچت ہو جائے گی۔

۳- پرچہ کی تاریخ اشاعت ہر مہینے کی سات مقرر ہے۔ اس کے بعد اگر ہم کوئی پرچہ روانہ کریں تو ہمیں محصول ڈاک دو نئے پیسے کی جگہ آٹھ نئے پیسے فی کاپی ادا کرنا پڑیں گے، اس لئے اگر آپ کو کسی ماہ کا پرچہ نہ ملے اس کی اطلاع ہمیں ضرور دیدیجئے، لیکن ہم اسے دوبارہ روانہ کریں گے آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ۔ اگر آپ اسے فوراً حاصل کرنا چاہیں گے تو ہم اسے رجسٹری روانہ کریں گے اسکے لئے آپ کو ۱۲ پیسے ادا کرنا پڑیں گے۔

۴- خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے اسے کہیں نوٹ کر لیجئے زبانی یاد رکھنا مشکل ہے۔

نگار کی ایجنسیاں

تاج نیوز ایجنسی ناگپور ـــ عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ـــ محمد الیاس نیوز ایجنسی کلکتہ ـــ تجمل خاں نیوز ایجنٹ کلکتہ ـــ
شہرت بک ڈپو احمد آباد ـــ محمد شمیم عبدالمنان احمد آباد ـــ صفیہ بک ڈپو بمبئی ـــ احمد علی خاں حیدر آباد ـــ بچوں کا کتاب خانہ بمبئی ـــ
اپنا کتاب گھر بمبئی ـــ ہندوستان بک ڈپو بمبئی ـــ احمدی بک ڈپو بمبئی ـــ کتب خانہ عابد روڈ حیدر آباد ـــ
شہاب بک ڈپو امراوتی ـــ ماڈرن نیوز ایجنسی کھنڈوا ـــ محمد اللہ بخش دربھنگہ ـــ شمس بک ہاؤس برہان پور ـــ
حبیب برادرس جمشید پور ـــ آزد کتاب گھر جمشید پور ـــ آزاد نیوز ایجنسی بنگلور ـــ محمد کریم بخش مظفر پور ـــ
علمی خزانہ اسنسول ـــ اسلامیہ بک ڈپو بھاگلپور ـــ عبداللہ عزیزی اکولہ ـــ فرینڈ سی نیوز ایجنسی بھلواڑہ ـــ
نواب میگزین رائے پور ـــ آر آر راہی کرنول ـــ سعید احمد ڈمکا ـــ دلیم احمد جودھپور ـــ دارالکتاب رام پور ـــ
غیور احمد عثمان آباد ـــ محمد شرف الدین پٹنہ ـــ جمیل مرزا علی گڑھ ـــ منظر امام نیوز ایجنٹ سمستی پور (دربھنگہ) ـــ
ماڈرن بک ہاؤس کان پور ـــ سنٹرل نیوز ایجنسی کناٹ پلیس نیو دہلی ـــ کتابی نیا پٹنہ ـــ سید ابراہیم منچریال -

پاکستان کے سول ایجنٹ :- ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

ضروری ہے اور اگر کسی ملک میں یہ دونوں چیزیں آسانی سے فراہم ہوسکتی ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہاں کے عوام مطمئن ہیں، لیکن آسانی سے مراد صرف فراوانی نہیں بلکہ ارزانی بھی ہے ورنہ صرف دولتمند طبقہ اس سے فایدہ اُٹھاسکے گا اور عوام بدستور محروم رہیں گے۔

پھر پاکستان کا حال تو ہمیں معلوم نہیں اور نہ وہاں کے حالات پر رائے زنی کا حق ہم کو حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہاں گرانی یقیناً ناقابل برداشت تک بڑھتی جارہی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ۹۷ء کے قحط عظیم میں (جب گیہوں روپیہ کا سات سیر ملتا تھا) تو لوگ چیخ پڑ اُٹھے تھے، لیکن آج جبکہ اس کا بھاؤ دو سیر فی روپیہ ہے، سمجھ میں نہیں آتا لوگ کیونکر زندہ ہیں۔ پھر یہ حال تو صرف غلہ کی گرانی کا ہے لیکن اگر اس میں کپڑے اور دوا علاج کے مصارف بھی شامل کرلئے جائیں تو ہندوستانی عوام کی موت و زیست کا مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ نظر آتا ہے، ایسا کیوں ہے، اس پر غور کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے

جب تک ملک آزاد نہیں تھا ہم اپنی تمام تکالیف کا سبب غیر ملکی حکومت کو قرار دیتے تھے، لیکن اب کہ ملک آزاد ہوچکا ہے حالات کیوں اور زیادہ خراب ہوگئے ہیں، اس سوال کے جواب میں بہت سی تاویلیں کی جاتی ہیں، لیکن عوام ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں، کیونکہ وہ تو صرف حقیقت کو دیکھتے ہیں، موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں اور دُنیا کی کوئی منطقی توجیہ ان کو مطمئن نہیں کرسکتی۔

جیساکہ ہمارے بعض صحافیوں کا خیال ہے، یہ درست ہے کہ ملک میں گرانی بڑھ جانے کے بعد بھی وہ بے چینی نہیں پائی جاتی جو اس سے پہلے خشک سالیوں کے زمانہ میں پیدا ہوجاتی تھی اور یہ بھی یقیناً درست ہے کہ اب کمائی اور اُجرت کا معیار بہت اونچا ہوگیا ہے یعنی پہلے جس مزدور کو پانچ بھر آنے ملتے تھے وہ اب ڈیڑھ روپیہ کمارہا ہے۔ جس ملازم کو پہلے دس روپیہ تنخواہ ملتی تھی وہ اب پچاس پارہا لیکن سچ پوچھئے تو یہ اضافۂ تنخواہ و اُجرت بھی گرانی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ہاں اگر گرانی کے لحاظ سے آمدنی میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوجاتا تو کوئی مضایقہ نہ تھا، لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہونا ممکن۔ مثلاً گیہوں کو لیجئے کہ اب سے ۵۰ سال پہلے وہ روپیہ کا بیس سیر ملتا تھا اور اب اس کا بھاؤ روپیہ کا دو سیر ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آمدنی میں دس گنے کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے پھر اسی کے ساتھ آپ دوسری ضروریات زندگی کو بھی اس میں شامل کرلیجئے تو معلوم ہوگا کہ اشیاء کی دس گنی گرانی کے مقابلہ میں، آمدنی کا اضافہ زیادہ سے زیادہ چوگنا ہوا ہے اور اس طرح ۶۰ فی صدی کی کمی اب بھی پائی جاتی ہے۔

اب آیئے اس اضافۂ آمدنی کے مسئلہ پر بھی غور کریں۔ یوں بظاہر یہ بات بڑی خوش آیند نظر آتی ہے کہ ہماری آمدنی دس کی جگہ چالیس ہوگئی ہے، لیکن کیا اقتصادی و مالیاتی نقطۂ نظر سے یہ کوئی بڑی اچھی بات ہے؟

جب کسی ملک میں اشیاء کی گرانی بڑھنے لگتی ہے تو حکومت تنخواہوں اور اُجرتوں میں اضافہ کردیا کرتی ہے، لیکن اس اضافہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لوگوں کو سونے یا چاندی کے سکّے زیادہ دینے لگتی ہے بلکہ وہ اتنے ہی زیادہ نوٹ چھاپ کر ملک میں پھیلا دیتی ہے اور اسی کا نام افراطِ زر (Inflation) ہے۔

یوں دیکھئے تو بات بہت آسان ہے کہ روپیہ کی جتنی ضرورت ہو حکومت اتنے ہی نوٹ چھپوا کر ملک میں پھیلا دے۔ لیکن دراصل یہ ناؤ کاغذ کی ہے اور زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی، کیونکہ اس طرح "زندہ رہنے" کے مصارف برابر بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ حکومت کے زرِ قرطاس (نوٹوں) کی قیمت گرتے گرتے اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ ملک میں زبردست اقتصادی بحران پیدا ہوجاتا ہے، مثلاً آپ فرانس کو لیجئے کہ اسی افراطِ زر کی وبا نے وہاں کیا قیامت برپا کر رکھی ہے۔

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو فرانس کے سارے ملک میں صرف ۶ ہزار ملین فرانک (۳۲۰ کروڑ روپیہ) کے نوٹ رائج تھے، لیکن جب جنگ ختم ہوئی تو ۳۰ ہزار ملین فرانک کے نوٹ ملک میں پھیل گئے ــــ اس کے بعد دوسری جنگ کے اختتام تک ۶۵۰ ہزار ملین فرانک تک پہونچ گئے اور ۵۸ء تک ۴۰۰۰ ملین فرانک تک۔ گویا حکومت کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ گرانی کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف نوٹ چھاپ چھاپ کر "افراطِ زر" سے کام لیتی رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پونڈ کھن جو اس سے قبل

دس فرانک میں ملتا تھا آج اس کی قیمت ۴۰۰ فرانک ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہی حال انڈے، پنیر، آلو اور دوسری ترکاریوں کا ہے کہ ۴۰ فیصدی اضافہ تو معمولی بات ہے ورنہ کبھی کبھی یہ اضافہ سو فی صدی تک پہونچ جاتا ہے۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ اس افراطِ زر کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں اور عوام کب تک اسے برداشت کر سکتے ہیں۔

جس وقت چین دورِ انقلاب سے گزر رہا تھا تو وہاں افراطِ زر نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ ملازمین کی تنخواہیں نوٹوں سے بھرے ہوئے تھیلوں میں ادا کی جاتی تھیں، اور یہ صورت اس وقت تک جاری رہی جب تک حکومت نے خود ملک کی پیداوار کو بڑھا کر گرانی کو ختم نہیں کر دیا۔ گرانی اشیاء کا مقابلہ محض افراطِ زر سے کوئی معقول بات نہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ عوام کی قوتِ خرید گھٹتے گھٹتے اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ آخر کار، نہ بازار میں کوئی گاہک نظر آتا ہے، نہ دوکان میں مال اور اس کا اثر چونکہ ملک کی تمام صنعت و حرفت پر پڑتا ہے اس لئے حکومت پر قرض کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔

افراطِ زر اس میں شک نہیں خود بڑا زبردست ٹیکس ہے اور یہ بوجھ بھی عوام ہی کو اٹھانا پڑتا ہے، لیکن عوام اسے محسوس نہیں کرتے۔ بالکل اپنے ہی جیسے دق کا مریض کہ وہ آخر وقت تک اپنی صحت کی طرف سے مایوس نہیں ہوتا، حالانکہ اس کی ہر سانس اسے موت سے قریب تر کرتی جا رہی ہے۔

ہندوستان بھی اس وقت اسی افراطِ زر کے خطرناک دور سے گزر رہا ہے اور ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد حکومت تمام منصوبہ بندیاں پس پشت ڈال کر صرف کاشت کی طرف توجہ کرتی — جب اول اول چین میں انقلابی حکومت قایم ہوئی تو وہاں یہ عالم تھا کہ تمام کھیتیاں اُجاڑ تھیں، آبپاشی کے تمام ذرایع تباہ و برباد ہو چکے تھے اور ملک دانہ دانہ کو محتاج تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر انقلابی حکومت نے تمام کاموں کو چھوڑ کر پہلے صرف کاشت کو مرکزِ توجہ قرار دیا اور پہلی پنج سالہ اسکیم محض اسی کے لئے وقف کر دی۔ پھر آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ انھوں نے صرف دو سال کے اندر نہروں اور بندوں کی تعمیر میں اتنی کھدائی کی جتنی نہر پناما میں نو سال کے اندر ہوئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی پنج سالہ اسکیم کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی چین نے اتنا غلّہ پیدا کر لیا کہ وہ اسے بیرونِ ملک میں بھی بھیج سکا۔

ہندوستان کے حالات چین سے بہت بہتر تھے۔ وہاں تو بالکل اُجڑے ہوئے گھر کو بسانا تھا، اور یہاں بسا بسایا گھر ہاتھ آیا تھا، لیکن وہاں کے اندیشے یہاں کے توقعات سے زیادہ قابلِ رشک نکلے۔ انھوں نے دھوئیں سے آگ پیدا کی اور ہم نے آگ کو بھی دُھواں بنا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہم بالکل ایسے ہو گئے جیسے کسی فاقہ زدہ انسان کو خلافِ توقع انواع و اقسام کے لذیذ کھانے میسر آجائیں اور وہ ہوکے کے مارے ضرورت سے زیادہ کھا کر بیمار ہو جائے۔ آزادی کے بعد ہم کو یہی ہوکا ہو گیا، ہم اسے ہضم نہ کر سکے اور ملک علیل ہو گیا۔ ہم نے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں پر غبطہ کر کے ان کے سطح تک پہونچنے کی کوشش میں بے تحاشا دوڑنا چاہا حالانکہ ہم اپنے پاؤں پر اچھی طرح کھڑے بھی نہ ہوئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم منھ کے بل گر پڑے — مغربی ممالک کی ترقیاں صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ نہ روم ایک دن میں طیار ہوا تھا اور نہ ہم دہلی کو ایک دن میں لندن و نیویارک بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے عمرِ خضر و صبرِ ایوب دونوں درکار ہیں۔

ہم کو اپنی ترقیاتی اسکیموں میں اول اول صرف دو چیزوں کو سامنے رکھنا چاہئے تھا۔ زراعت و تعلیم، یعنی ایک یہ کہ ملک اتنا غلّہ پیدا کرنے لگے کہ ہمیں امریکہ و آسٹریلیا کا منھ نہ دیکھنا پڑے اور تعلیم اتنی عام ہو جائے کہ کوئی فرد جاہل نہ رہے۔ اس کے لئے ضرورت اس کوشش کی تھی کہ ابتدائی مدارس سے لیکر کالجوں تک ہر قسم کی تعلیم عام اور مفت کر دی جائے اور دوسرے یہ کہ کسی زمین کا کوئی حصّہ بنجر نہ رہنے دیا جائے، لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب تمام دوسری اسکیموں کو ملتوی کر کے

ملکی دولت کا بڑا حصہ انھیں دونوں باتوں پر صرف کیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ بہت سا وہ روپیہ جو صرف انھیں دو اسکیموں پر خرچ ہونا چاہئے تھا، دوسری اسکیموں پر صرف ہوگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اسکیم ادھوری رہ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ ترقی کاشت کے سلسلہ میں متعدد بند طیار ہو رہے ہیں، نہریں جاری کی جا رہی ہیں، لیکن فنڈ کی کمی کی وجہ سے ان میں سے اکثر کام تکمیل کو نہیں پہونچ سکے اور ملک کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ مغربی ممالک کے تتبع میں ہم بھی ترقی کا مفہوم یہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ عوام کا "معیارِ زندگی" بلند ہونا چاہئے، حالانکہ اس کو بجائے بلند کرنے کے بہتر بنانے کی ضرورت تھی۔ بلندی معیار کا انتہائی تصور مغربی ممالک میں یہ ہے کہ ہر شخص موٹر نشین ہو جائے اور وہاں یہ تصور غلط نہیں، کیونکہ وہاں کی حکومت نے عوام کو "آب و نان" کی فکر سے آزاد کر دیا ہے، لیکن یہاں ابھی شکم پُری ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں، عیش و تنعم کا کیا ذکر۔ الغرض اصل چیز معیارِ زندگی کو بہتر بنانا ہے جس کا تعلق زیادہ تر سادگی سے ہے، نہ کہ نمود و نمایش سے۔ سادہ غذا، سادہ لباس، صاف ستھری سادہ معاشرت ایک خاص قسم کی روحانیت اپنے اندر رکھتی ہے، جس کا اثر ہمارے اخلاق پر بھی پڑتا ہے، برخلاف اس کے پُرتکلف، شاندار زندگی ہم کو عوام سے الگ تھلگ رہنا سکھاتی ہے اور ہم اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھنے لگتے ہیں — ہمارے ملک کے تمام افسران و حکام عام طور پر اسی ذہنیت کا شکار ہیں اور اس رعونت کا سبب صرف فرقِ معاشرت ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی جو سلسلۂ گفتگو میں زبان پر آگئی۔ اصل مقصود تو یہ کہنا ہے کہ اربابِ حکومت نے ملک کے ذرائع ترقی پر زیادہ غور نہیں کیا ورنہ پہلے وہ صرف زراعت و تعلیم کو سامنے رکھتے اور اپنی تمام قوتیں انھیں دو کی تکمیل پر صرف کر دیتے اس کے بعد وہ دوسری اسکیموں کو لیتے۔ پچھلے دس سال کے اندر کروروں روپیہ ایسی عمارتوں میں صرف ہوا ہے جن کی ملک کو کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ ان کا تعلق صرف جذبۂ افتخار و تبختر سے تھا۔ اس بیجا اسراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکس کا غیر معمولی بار عوام پر بڑھ گیا، انصاف کی قیمت کئی گنا زیادہ ہو گئی اور ضروریات زندگی گراں تر ہو گئے۔

اس کا علاج حکومت نے یہ کیا کہ تنخواہوں اور اُجرتوں میں اضافہ کر کے ملک میں نوٹ زیادہ پھیلا دئے یعنی صرف "افراطِ زر" سے اس نے لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا، حالانکہ یہ حکمتِ عملی کوئی پایدار بات نہیں اور مرض کا صرف وقتی علاج ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جس حد تک حکومت کی نیت کا تعلق ہے، ہم اسے قابل الزام قرار نہیں دے سکتے، وہ یقیناً یہ چاہتی ہے کہ ملک خوشحال ہو، ترقیوں کے جتنے طبعی و غیر طبعی ذرائع و وسایل اسے حاصل ہیں ان سے کام لے، لیکن طریق کار درست نہیں۔ ملک کی اصلاح و ترقی ایک دن کا کام نہیں اس کے لئے بڑے غور و فکر اور تدریجی اقدامات کی ضرورت ہے۔ دوڑنے سے پہلے پاؤں کی سکت کا اندازہ کر لینا ضروری ہے اور ہماری حکومت نے یہی نہیں کیا۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ہمارے یہاں کام کرنے والے بہت پست ذہنیت کے ہیں اور ان کے عوامل فکر ذاتی اغراض و مقاصد سے پاک نہیں، ان کے سامنے ملک و قوم کا نہیں بلکہ خود اپنا فایدہ ہے، وہ قوم کی دولت کو قوم کی نہیں بلکہ خود اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور فرض شناسی کا احساس ان میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ یقیناً اس کا علاج بہت دشوار ہے۔ لیکن اگر عمال کا تقرر اسناد و سفارش سے گزر کر صرف اہلیت کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو ایک حد تک اس کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن اس راہ میں بھی تعصبات حایل ہیں اور سب سے پہلے اقلیت و اکثریت کا سوال سامنے آتا ہے۔

اس سلسلہ میں، عمال حکومت کی ان اخلاقی پستیوں کا ذکر مناسب نہیں، جن سے ملک کے عوام کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور جو اپنے طرزِ عمل سے جمہوریت کے اصول کو ہر وقت توڑتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بڑے تفصیلی بیان کا محتاج ہے۔ ہمیں تو فی الحال یہ کہنا ہے کہ حکومت گرانی اشیاء کے بارے میں جن تدابیر سے کام لے رہی ہے، وہ ناقص اور نامکمل ہیں اور محض "افراطِ زر" سے اس خلا کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

اریجن

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

اریجن ۱۸۵ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۴ء میں انتقال کیا۔ فائلو یہودی کی طرح اریجن نے بھی اسکندریہ میں عمر بسر کی اور چونکہ وہ نو افلاطونیت کے مزعومہ بانی امونی اس ساکاس کے شاگرد ہونے کی وجہ سے فلسفہ سے واقف تھے بنا بر ایں پروفیسر رسل کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ عیسائیوں کی مقدس کتابوں اور کتب فلسفہ کا باقاعدہ امتزاج اریجن کے عصر میں ہوا[1]۔ بلکہ میری رائے میں تو اریجن ہی وہ واحد عیسائی متکلم ہیں جنھوں نے تخلیق کائنات کے مسئلہ میں نہ سہی عقیدۂ تثلیث میں فلاسفہ کی پوری ہم نوائی کی یعنی جس طرح اریجن کا پیر بھائی فلاطینس سب سے زیادہ عظیم المرتبت احد کو سمجھتا تھا پھر عقل کو اور پھر روح کو[2]۔ اسی طرح اریجن اقانیم ثلثہ میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت باپ کو سمجھتے تھے پھر لوگوس یعنی بیٹے کو اور پھر روح القدس کو[3]۔

خوش قسمتی سے ان کی بعض تصانیف موجود ہیں اور ان سے ان کے فلسفیانہ اور مذہبی نظریات کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ان تصانیف میں سب سے زیادہ طولانی تصنیف اگینسٹ سلسوس ہے جس میں سلسوس کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو سلسوس نے نصرانیت پر کئے تھے۔ سلسوس کا اہم ترین اعتراض یہ تھا کہ نصرانیت یہودیت سے ماخوذ ہے اور چونکہ یہودی وحشی ہیں لہذا نصرانیت یونانیوں ایسی متمدن قوم کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اریجن نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ شخص جو فلسفۂ یونان سے واقف ہے اگر اناجیل اربعہ کو عقل کی میزان میں تولے گا تو اس پر یہ امر مبرہن ہو جائے گا کہ عقلاً اناجیل اربعہ صحیح ہیں، علاوہ ازیں اناجیل اربعہ کی صحت، صحیح پیش بینیوں سے بھی ثابت ہے اور یہ صحیح پیشین گوئیاں یونانی منطق سے بھی کہیں زیادہ صحیح الدلالۃ ہیں[4]۔ پروفیسر رسل نے اریجن کے اس جواب پر یہ صحیح اعتراض کیا ہے کہ مذہب کے تحفظ کے لئے یا تو صرف دلیلِ عقلی پیش کرنا چاہئے یا صرف دلیلِ نقلی مگر اریجن نے عقل اور نقل دونوں سے کام لیا ہے اور عقل اور نقل کا یہ امتزاج

۱۔ "A History of western Philosophy" Page 346

۲۔ "Plotinus" By Armstrong Page 35

۳۔ "A History of Philosophy" By Thillyp. 176

۴۔ "A History of western Philosophy" By Russell Page 347-48

صرف اریجن کی خصوصیت خاصہ ہے بلکہ تمام عیسائی فلسفہ کا طرۂ امتیاز ہے[1]۔ لیکن میری رائے میں یہ امر عیسائی فلسفہ سے مختص نہیں ہے بلکہ ہر مذہب کے متکلمین کا استدلال بالعموم عقل اور نقل پر مشتمل ہوتا ہے۔

عقیدۂ تثلیث کی طرح اریجن کا تصورِ الٰہ بھی فلاطینس کے تصورات کے مماثل ہے یعنی اریجن کے نزدیک بھی خدا عقل اور وجود سے ماورا ہے اور کائنات خدا کا مظہر ہے لیکن اس مظہر کے لئے ایک وسیلے کی ضرورت ہے اور وہ وسیلہ لوگوس یعنی عقل یعنی خدا کا بیٹا مسیح ہے جس نے روح القدس کی تخلیق کی اور چونکہ حضرت عیسیٰ خدا سے جُدا نہ ہونے کے باوجود ممیز ہیں اور جس طرح سورج اور سورج کی شعاع ایک ہی جوہر سے الگ نہ ہونے کے باوجود نظرِ ظاہر بیں میں علیحدہ ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ ہیں تو ازلی اور ابدی اور خدا کا اور حضرت عیسیٰ کا جوہر تو ایک ہے مگر نظرِ ظاہر بیں میں بیٹا باپ سے ظاہر ہوا ہے لہذا بیٹا باپ سے رتبے میں کم ہے۔ اسی طرح روح القدس کی تخلیق حضرت عیسیٰ نے کی لہذا روح القدس حضرت عیسیٰ سے رتبے میں کم ہے[2]۔

اریجن کے خیال میں باپ بیٹے اور روح القدس کے علاوہ کائنات کی کوئی شے غیر مادی نہیں ہے اور اس کے نزدیک ثوابت و سیار اجسام ہیں جنھیں خدا نے ایسے ارواح عنایت فرما دئے ہیں جو ازل سے موجود تھے لہذا انسانوں کی طرح آفتاب بھی گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ اسی طرح آدمیوں کی پیدائش کے وقت اُن کے اجسام میں ازلی اور ابدی ارواح بھی کہیں اور سے داخل ہوتی ہیں لیکن یہ تمام ارواح غیر مادی نہیں ہیں ہاں جب یہ ارواح نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے بعد عقل میں شامل ہو جاتی ہیں تو پھر غیر مادی بن جاتی ہیں اور مادّے کی قید سے نجات حاصل ہونے ہی کا نام غفران ہے۔ اریجن کے خیال میں کبھی کبھی تمام ارواح کو یہاں تک کہ شیطان کو بھی نجات حاصل ہو جائے گی[3]۔

ان تمام فلسفیانہ نظریات کے باوجود اریجن کا بائبل پر اعتقاد تھا اور وہ یہ کہتا تھا کہ جب ہومر وغیرہ کے صنمیات کو صحیح سمجھا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہودیوں کے روایات کو صحیح نہ سمجھا جائے[4]۔ لیکن باوجودیکہ اریجن کو عیسائی مذہب کا پیشوا تسلیم کیا جاتا تھا[5]۔ تاہم اس کے انتقال کے بعد اس کے درج ذیل عقاید کی وجہ سے عیسائی دُنیا میں ہدفِ ملامت بنایا گیا اور سینٹ جیروم کو اریجن کے عقاید کی صفائی میں زورِ قلم صرف کرنا پڑا۔

اولاً یہ کہ وہ افلاطون کی طرح ازلی ارواح کا قایل تھا۔

ثانیاً یہ کہ اس کے نزدیک حضرت عیسیٰ کا نہ صرف جوہر الوہیت قدیم تھا بلکہ اوتار لینے سے قبل حضرت عیسیٰ کا پیکرِ انسانی بھی قدیم تھا۔

ثالثاً یہ کہ قیامت کے دن ہمارے اجسام جسمانیت کی قید سے آزاد ہو جائیں گے اور رابعاً یہ کہ اریجن کے خیال میں آخر میں سب لوگوں کو یہاں تک کہ شیطان کو بھی بخش دیا جائے گا[6]۔ (باقی)

---

[1] "A History of western Philosophy" Page 348
[2] "A History of Philosophy" By Thilly Page 176
[3] "A History of western Philosophy" Page 346-47
[4] Ibid Page 351
[5] "Western Mysticism" By Butler Page 203
[6] "A History of western philosophy" Page 347

چند دن وادی دجلہ و فرات
اور
سرزمین قلوبطرہ میں

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)

بغداد - الف لیلہ کی سرزمین، ہارون الرشید کا پائے تخت، ابونواس کے خوابوں کی حسین دُنیا - عرض نہیں کرسکتا، اس شہر کے تصور ہی میں میرے لئے دل کشی اور جاذبیت کا کتنا بڑا سامان پوشیدہ تھا - ایران میں دس روز وزارت فرہنگ کے مہمان کی حیثیت سے گزارے تھے اور خاطر داری اور دل نوازی کے جتنے شیوے اور انداز ہوسکتے ہیں اُن سب سے میں پوری طرح مسرت اندوز ہوچکا تھا، لیکن ان حسین یادوں کے ہجوم میں بھی جب بغداد کا خیال ذہن کے جھروکے سے جھانکتا تو میں ایک نامعلوم خوشی سے چونک پڑتا - یہ محسوس ہوتا کہ الف لیلہ کی رنگینیاں مجسم ہوکر مجھ سے مل گئی ہیں، یا دجلہ و فرات کی شیرینیاں خود میری زندگی میں تحلیل ہوگئی ہیں - "خدا حافظ" - "سپردم بخدا" اور "دیدۂ و دل ہمراہِ شما" کی شیریں آوازوں کے درمیان بالآخر طیارہ بلند ہوگیا اور تھوڑی دیر میں، میں سچ مچ بغداد کی سرزمین میں پہونچ گیا - میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب پہلا ہی احساس یہ ہوا کہ تصور اور حقیقت میں زیادہ فرق نہیں ہے - ابوالحسن کا جیتا جاگتا خواب - شاہد و شعر کا گہوارہ" میرا بغداد یہی تھا -

میرے ٹھہرنے کا انتظام، ریجنٹ پیلس ہوٹل (Regent Palace Hotel.) میں "شارع رشید" پر کیا گیا تھا اور سفارت خانہ ہند کے دوستوں نے وہ تمام سہولتیں بہم پہونچائی تھیں جو ایک "غریب شہر" کے لئے ضروری ہیں - لیکن میں بغداد کو خود دریافت کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اکیلا نکل کھڑا ہوا، "امانہ" میں بیٹھا، پیدل چلا، لوگوں سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں راستہ پوچھا اور گھوم پھر کے دجلہ کے کنارے پہونچ گیا - شام کا وقت تھا، دجلہ کی لہریں بڑی خوش خرامی سے بہہ رہی تھیں - مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کوئی شہرزاد، مزے لے لے کر اپنی کہانیاں سنا رہی ہو - یا کوئی لیلیٰ اپنا ساز چھیڑ رہی ہو - ایک خوشرو اور ذہین عراقی نوجوان قمیص اور پتلون پہنے کپڑے کی آرام کرسی پر لیٹا تھا، اس کے قریب ایک خالی کرسی پڑی ہوئی تھی، میں نے اُس سے پوچھا:-

"میں آپ کے قریب اِس کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں - ؟"

اُس نے سرو قد تعظیم دی اور کہا:- "بڑی خوشی سے ! - آپ نووارد ہیں؟"

"جی ہاں !"

"کب تشریف آوری ہوئی ؟"

"آج ہی اس خوبصورت شہر میں حاضر ہوا ہوا ہوں"

"ہندوستان سے، یا پاکستان سے ؟"

"ہندوستان سے !"

"جی - ؟ پاکستان سے !" اس نے پھر تجاہل سے پوچھا -

"جی نہیں، ہندوستان سے" - مجھے، سچ بات ہے، اُس کا یہ شبہ کا انداز پسند نہیں آیا -

"معاف کیجئے گا، میں سمجھ نہیں پایا تھا - آپ لوگوں کے خط و خال ایک سے ہوتے ہیں - مرحبا، کہ آپ ہندوستانی ہیں - ہندوستان کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، میں اُسے "ایشیائی امیدوں کا مینار" کہتا ہوں - اس رشتہ سے آپ میرے بھائی ہیں - ہندوستان خود بھی آزاد ہے اور اُسے دوسروں کی آزادی بھی عزیز ہے۔" اُس نے باقی جملہ انگریزی میں کہا، اور میں اُس کا صحیح، انگریزی لب و لہجہ دیکھ کر ششدر رہ گیا :-

One loves freedom only When one values not his own freedom but the freedom of others. That's what India is doing. I Cannot shout "I am a free Iraqi and then park my car at a Crossroad!

اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا :- "آیئے قہوہ پئیں، اُس کے بعد گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔"

میں نے کہا :- "قہوے میں مضایقہ نہیں - لیکن کھانا میں ہوٹل میں کھاؤں گا - آپ بھی وہاں تشریف لے چلیں۔"

"دیکھئے صاحب، آپ میرے مہمان ہیں اور ردِّ دعوت گناہ ہے، گناہ! قہوے کا تو بہانہ ہے یہاں تو میں آپ کو اس لئے لایا ہوں کہ والدہ کو ٹیلی فون کر کے آپ کی تشریف آوری کی اطلاع کر دوں - ہمارا سارا گھر "نہرو کے دیس سے" آئے ہوئے مہمان کو دیکھ کر بے حد خوش ہوگا۔"

نوجوان کے انداز میں اس درجہ خلوص تھا کہ مجھے اُس کی دعوت قبول کرنا پڑی -

مجھے مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا - سب سے تعارف ہوا -

"یہ میری بہن ہے - اس کے دو شغل ہیں، کتابیں پڑھتی ہے اور مجھ سے لڑتی ہے۔" (اُس نے حُمرہ وغازہ استعمال کیا تھا لیکن بڑے سلیقے سے - حیا و شرم کی تصویر -) - "یہ میری والدہ ہیں اور -" ماں نے جملے کو پورا کرتے ہوئے کہا :-

"یہ میری بہن ہیں۔"

"حقیقی؟ آپ میں اور ان میں تو بڑا فرق ہے۔"

"یہ میرے شوہر کی بیوی ہیں - اس طرح میری بہن ہیں - سگی بہنوں میں وہ میل کہاں ہوگا جو ہم دونوں میں ہے - میرے کوئی اولاد نہیں تھی - کربلا میں منتیں مانگیں، شیخ معروف کے کنوئیں پر نہائی، بی بی مریم کا سبز دھاگہ پہنا، حضرت ذکریا کا روزہ رکھا، لیکن سب بے سود - بے نتیجہ - اِن بہن کو سچ پوچھو تو میں نے ہی انتخاب کیا، یہ بچے انھیں کے ہیں - ان کو دیکھ کر میرے ٹھنڈک پڑتی ہے -

کھانا لگ گیا تھا - ڈرائنگ ہال میں داخل ہوا تو نگار خانہ - لیکن اس کی تزئین و آرائش صرف ایک ہی شخص کی تصویروں سے کی گئی تھی - اور وہ شخصیت تھی جمال عبدالناصر کی -

میں نے کہا :- "آپ نے اس کمرہ کو خوب سجایا ہے - جمال عبدالناصر ہر اعتبار سے لائق احترام ہیں - وہ دہلی بھی تشریف لائے تھے، اس روز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلی کی ساری آبادی ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کو امڈ آئی ہے۔"

نوجوان نے کہا :- "جی ہاں، اُن کی ہمارے دلوں میں بڑی عزت ہے - دمشق میں بھی یہی ہوا - بلا مبالغہ لبنان کی ½ آبادی صرف اُن کی تقریر سننے کے لئے دمشق پہونچ گئی تھی -

لڑکی بولی :- "وہ عرب نیشنلزم کی نشانی ہیں اور قرون اولیٰ کے بعد عرب دنیا کی سب سے بڑی شخصیت۔"

"لیکن ذہنی گرویدہ بندیاں تو نیشنلسٹ تحریکوں کو برداشت نہ کر سکیں گی۔"

لڑکی نے غصہ سے کہا:۔ "ہم ہی انھیں کب برداشت کرسکیں گے۔ آپ دیکھیں گے۔ ایک سوئی کے چبھنے کی دیر ہے۔ ذراسی دیر میں نوری السعید کے غبارے کی پھونک نکل جائے گی۔ اگر وہ قدرتی موت مرگئے تو ہم ان کی قبر کھود دیں گے اور آلیور کرامول کی طرح ان کو پھانسی دیں گے"۔

شمشیر کی یہ عریانی دیکھنے کے قابل تھی! اس کا جلال وجمال اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

میں نے عرض کیا کہ عرب نیشنلزم، سماجی تنظیم اور قومی اتحاد کا بڑا خوبصورت اظہار ہے بلکہ دراصل مغربی استحصال کے خلاف ایک اثباتی اور تعمیری ردعمل ہے۔ ہماری ہوشمندی اس میں ہے کہ تخلیقی اور تعمیری پہلوؤں کو استوار کرکے اس کا رشتہ انسانی برادری سے جوڑیں جیسا کہ ہندوستان میں پنڈت نہرو کی کوشش ہے"۔

نوجوان نے کہا "نہرو اور ناصر دونوں جمہورت اور اس کے تخلیقی عمل پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ اثباتی غیر جانبداری ہے جس سے جمال عبدالناصر، دہلی جدید میں بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

لڑکی نے اپنے بھائی کو مخاطب کیا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہنے لگی "تم ہمیشہ ناک غلط پکڑتے ہو۔ پہلی چیز سچی آزادی ہے۔ اس کے بعد ہی اثباتی غیر جانبداری، جمہوریت اور تخلیقیت کی بات ہوسکتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں غلام کی غیر جانبداری کے کوڑی کی؟ یوں امن پسندانہ تعمیر اور منصوبوں کا ذکر نوری السعید بھی کرتے ہیں۔ (میری طرف دیکھ کر) آپ نے ان کے عراقی اہرام دیکھے؟ لیکن یہ ہمارے درد کا علاج نہیں"۔

اگلے روز میں کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف گیا، جو اب تک سجدہ گاہِ عاشقاں ہے اور جہاں انسانیت، انصاف اور آزادی کے تحفظ کے لئے دنیا کی سب سے بڑی قربانی پیش کی گئی تھی۔ اس عظیم الشان مثال کے پس منظر میں سوچتا رہا کہ اولاد ابراہیم بھی ہے۔ آتشِ نمرود بھی ہے۔ کیا پھر کوئی امتحان کی گھڑی آنے والی ہے؟ یہ شبہ میرے دل میں برابر کھٹکتا رہا۔ بالآخر وہ شبہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کے انقلاب کی شکل میں حقیقت بن کر نمودار ہوا اور ساری دنیا اس حقیقت کو اس طرح ماننے پر مجبور ہوئی جس طرح انوارِ صبح آفتاب کے طلوع ہونے کا قطعی اور آخری ثبوت ہوتے ہیں۔

میری دوسری منزل دمشق تھی۔ پسند کا معاملہ ذوقی اور وجدانی ہے۔ اس لئے مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ دمشق سے زیادہ خوبصورت شہر اور اس سے زیادہ خوبصورت لوگ میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ حالانکہ آفاق ہا گردیدہ ام! سعدی نے شکایت کی تھی کہ یاراں فراموش کردند عشق۔ اب وہ "قحط سالی" بھی نہیں۔ میں جس زمانہ میں گیا ہوں عرب فسٹی ول اور عرب نمائش ہورہی تھی اور سارا شہر زفرق تا بقدم، دلھن بنا ہوا تھا۔ سچ مچ شہر نگار۔ عروس البلاد۔ اب فرانسیسی اثر فنا ہورہا ہے، لیکن شامی اور یورپی ذوقِ جمال نے مل کر بڑی دلکش صورت اختیار کرلی ہے۔ لوگ آسودہ حال، باخبر اور مہمان نواز معلوم ہوئے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب ہی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور مجھے اپنے گھر لے گیا اور میں نے بھی اس کی دعوت کو اس خیال سے منظور کرلیا کہ ایک عامی کے گھر کی معاشرت بھی تو دیکھوں۔ اس کے یہاں ثلاجہ (ریفریجریٹر) اور ریڈیو گرام موجود تھا۔ اس کے تبسم میں خلوص اور دلکشی تھی اور اس کے برتاؤ میں وہ خود اعتمادی جو ایک آزاد شہری کی خصوصیت ہے۔

مجھے عرب اکادمی نے مدعو کیا تھا۔ اس تقریب کی خوش گوار یاد اب تک باقی ہے۔ ایک بزرگ میرے قریب آئے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں تو بے حد خوش ہوئے، گلے لگایا اور خطیبانہ انداز میں فرمایا:۔

"سیدی، نہرو کے ملک سے آئے ہو، مفسرِ قرآن، بطلِ حریت ابوالکلام کے دیس سے آئے ہو۔ آؤ ہماری آنکھوں پر آؤ، ہمارے دل میں بیٹھو۔ تم ہماری آنکھوں کی روشنی، ہمارے جی جگر اور مہمانِ عزیز ہو۔ یا عینی یا فؤدہ آج شب کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ میں عربی کھانا کھلاؤں گا۔ اپنے بچوں سے ملاؤں گا۔ میں تمہاری ہاں سننے کے لئے بے چین ہوں"۔

کھانے میں بلا مبالغہ دس قسم کے کھانے تھے لیکن اس سے زیادہ وہ علمی اور روحانی غذا تھی جو ان کے دسترخوان پر میسر آئی۔ کچھ اقبال کا ذکر آگیا۔ انھوں نے اس کے بیسیوں شعر ایرانی لب و لہجہ میں سنا ڈالے لیکن فرمایا "میں اقبال کو اچھا شاعر تسلیم کرتا ہوں لیکن بڑا شاعر نہیں مانتا۔ اس کا دائرۂ فکر میرے نزدیک اتنا وسیع نہیں جتنا ہونا چاہئے۔" اس کے بعد بڑی خوش آہنگی سے حافظ کا یہ شعر پڑھا اور چپ ہو گئے:۔

دہانِ یار کہ درمانِ دردِ حافظ ہست
فغاں کہ وقتِ مروت چہ تنگ حوصلہ بود!

لبنان پہونچا تو طبعی ماحول یکسر بدل چکا تھا۔ جب طیارہ بیروت کے مطار، خالدی پر اترنے لگا تو سرو و صنوبر کے درختوں اور برف کے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے بحیرۂ روم کا نیلا پانی صاف نظر آنے لگا اور سب سے زیادہ اہم یہ کہ قدیم رومی دور کے شہر بعلبک کے کھنڈر اور پیڑا اور باخوس کے مندر کے عظیم الشان تاریخی آثار۔ اپنی حشر ساماں یادوں کے ساتھ تاریخ کے اوراق کی طرح سامنے بکھرے ہوئے تھے

بیروت کی امریکن یونیورسٹی بڑی خوبصورت جگہ واقع ہے۔ ان کے پروفیسروں سے جو ملاقاتیں ہوئیں، ان کا نقش اب تک میرے دل پر ہے لیکن یہاں میں صرف ایک لبنانی طالب علم کا ذکر کروں گا جو گھسیٹ کر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا باپ قالینوں کی تجارت کرتا تھا اور اس کے پاس اُردو گانوں کے ریکارڈوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا اس نے "دو بیگھے زمین" اور "آوارہ" ہندوستانی فلموں کو کئی کئی بار دیکھا تھا اور ان کے گانوں کو حفظ کر لیا تھا۔ جب وہ "آوارہ ہوں - آوارہ" کو عربی قرأت کے ساتھ دست افشاں اور پاکوباں ادا کرتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ ہندوستان ہو یا لبنان، ہمارا مشرقی دل ایک ہی تال اور ایک ہی سُر پر یکساں دھڑکتا ہے۔ ہمارا طبعی ماحول کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو لیکن ہمارا مزاج اور ہمارے مسئلے بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔

مصر میں اُس وقت پہونچا جب وہ قلزم خون سے گزر چکا تھا۔ سوئز کے ہنگامے کے بعد۔ قاہرہ میں کوئی میرا دوست ہے، کوئی عاشق، کوئی معشوق، لیکن میں نے کسی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں کی تھی۔ شہر میں اجنبیانہ وارد ہونا چاہتا تھا تاکہ شہریوں کے فطری سلوک اور ان کے عمومی ذہن کا اندازہ کر سکوں۔

میونک سے ۳ر جنوری کو رات کے بارہ بجے چلا تھا۔ برف باری ہو رہی تھی اور تا حدِ نظر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سفید چادر ہے جو بچھی ہوئی ہے۔ علی الصباح قاہرہ پہونچ گیا۔ یہاں کا موسم معتدل تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ ہوٹل پہونچتے ہی سو گیا اور صبح کو بہت دیر میں آنکھ کھلی۔ ناشتہ کے بعد معلوم ہوا کہ ایک مصری میرے انتظار میں ہیں۔ میں حیران کہ کون صاحب ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میرے تعارف کے لئے صرف یہ کافی ہے کہ مجھے میونک سے آپ کی ہم سفری کا شرف حاصل ہے۔ رات کا وقت تھا۔ ہر شخص پر غنودگی طاری تھی۔ شاید آپ نے مجھے نہیں دیکھا۔ میری آج چھٹی ہے۔ کئی مہینے کے بعد اپنے گھر قاہرہ آیا ہوں۔ کیا آپ مجھے یہ خوشی بخش سکتے ہیں کہ آج کا دن میرے ساتھ گزاریں۔ میری سفارش کے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے۔"

ان کے پاس موٹر تھی۔ رات کے گیارہ بجے تک ہم لوگوں نے تقریباً آدھا قاہرہ دیکھ لیا۔ یونیورسٹی، اہرام[1]، ابوالہول، عجائب خانہ، تاریخی مساجد، قہوہ خانے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم نیا مصر تھا جو سوئز کی لڑائی میں بھی چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ اس کو صدیوں کے بعد ملوکیت کے ظلم سے چھٹکارا ملا ہے اور وہاں پہلی دفعہ ایسی حکومت قایم ہوئی ہے جس کی بنیاد صحیح جمہوری اصولوں پر ہے۔ یہ کام

---

[1] ان کے مثلث مینار کا یہ کتبہ دلچسپی سے خالی نہیں جو ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں نقل کیا ہے:۔ "بنینا ہذہ الاہرام فی ستین سنۃ فلیھدمھا من یرید ذالک فی ستمائۃ سنۃ فان الھدم الیسر من البناء" یعنی ہم نے تو اس اہرام کو ساٹھ برس میں بنایا ہے مگر جو اس کو ڈھانے کا ارادہ رکھتا ہے وہ بھلا اس کو چھ سو برس میں توڑ ڈالے حالانکہ بنی ہوئی عمارت کا کھود ڈالنا اس کے بنانے سے بہت سہل ہے۔ خ، ا، ن

۱۹۱۹ء کے قومی انقلاب میں بھی نہیں ہوا تھا۔ اب سلطانیِ جمہور کا دور دورہ ہے اور صنعتی مزدوروں اور فلاحین کو پہلی دفعہ اپنی محنت کا صلہ ملا ہے۔ مصر کی ۹۰ فی صدی آبادی زراعت پیشہ ہے زرعی اصلاحات نے ان کی تقدیر بدل دی ہے، اب ان کے سامنے زمین کو زیرِ کاشت لانے کے بڑے بڑے منصوبے ہیں۔ اصلی چیز وہ تعمیری جذبۂ عمل ہے جس کو انقلاب نے بندشوں سے آزاد کر دیا ہے اور جس کو سوئز کے ہنگامے میں اور زیادہ تقویت حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمہوری تحریک تاریخ کا حادثہ نہیں بلکہ اسکی جڑیں دور تک چلی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے آج تعلیم، زراعت، صنعت۔ ہائڈسنگ، صحت ہر شعبے میں تازہ خونِ زندگی دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سالوں کا کام مہینوں میں ہوا ہے اور بغیر کسی تشدد کے۔ بقول میرے دوست کے مصریوں نے الصلواۃ خیر من النوم کا مطلب جان لیا ہے۔ نیا مصر شہد کی مکھیوں کا چھتہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص سرگرم عمل اور مستعد۔

چلتے وقت وہ مصری دوست اس طرح معذرت کرنے لگے جس طرح ہندوستان میں لڑکی والا براتیوں سے معذرت کرتا ہے:۔

"میں آپ کی کچھ خاطر نہیں کر سکا"۔

"آپ مجھے کیوں شرمندہ اور محجوب کرتے ہیں۔ اتنا قیمتی وقت میرے ساتھ صرف کیا۔ اس سے زیادہ خاطر اور کیا ہوگی؟"

"آپ میرے محسن ہیں"

"میں؟! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ احسان آپ نے کیا ہے کہ اپنی معیت کا شرف بخشا، اپنی کار میں، اتنی اچھی سیر کرائی"۔

"ہر ہندوستانی ہمارا محسن ہے۔ سوئز کے معاملہ میں آپ نے ہماری مدد فرمائی۔ ہم اس بات کو بھول نہیں سکتے"۔

"آپ کی آزادی سے ہماری آزادی کی بنیادیں بھی تو مستحکم ہوتی ہیں۔ آفریں ہے کہ آپ نے اِس آزمائش کا بڑی بہادری اور ہوشمندی سے مقابلہ کیا۔ موجودہ جنگ بڑی صبر آزما اور ہلاکت آفریں ہے"۔

ہلاکت آفریں تو ہے لیکن آزادی کے جذبہ کو دنیا کی بڑی سے بڑی ہلاکت آفرینیاں بھی فنا نہیں کر سکتیں۔ ایسے ہی موقع پر ساتھی ملکوں کی ہمدردیاں انسانی عزائم میں قوت پیدا کرتی ہیں۔ آپ جائیں تو سرزمین ہند کو ہمارا سلام کہئے"۔

اُس دوست نے جس گرم جوشی سے مصافحہ کر کے مجھے رخصت کیا، اُس کا اثر اب تک میرے دل پر ہے۔ (نشریہ)

رعایتی اعلان

من و یزداں ۔ مذہبی استفسارات و جوابات ۔ نگارستان ۔۔۔۔
جمالستان ۔ مکتوبات نیاز تین حصے حسن کی عیاریاں ۔۔۔۔
مالہ و ماعلیہ ۔۔۔ مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم ۔۔۔ مذہب ۔۔۔
قول فیصل ۔۔۔ شہاب کی سرگزشت ۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد ۔۔۔
فراست الید = ۔۔۔ میزان = ۔۔۔
یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا دوسرا مجموعہ

"نقشِ آزاد"

مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، جس میں ۸۰ صفحات صرف غالب و غالبیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساٹھ روپیہ پیشگی بھیج کر دفتر نگار سے حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

نساخ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی روشنی میں

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(سید مقبت الحسن)

۱۸۶۶ء میں نساخ کا تبادلہ بھاگلپور کمشنری کے ضلع بانکا میں ہوگیا - یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں شاہ نوری صاحب شہبازی سجادہ نشین مولوی وحیدالدین خانصاحب جج عدالت بھاگلپور و مونگیر اور مولوی امداد علی خاں صاحب اعلیٰ صدر امین خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ابھی قیام بھاگلپور کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن ان کے گلے سے کچھ خون آیا - یہ سخت گھبرائے اور دو مہینے کی رخصت لے کر کلکتہ چلے آئے - پہلے تو یہیں علاج معالجہ کرایا لیکن جب حسب خواہ فایدہ نہ ہوا تو احباب نے مشورہ دیا کہ دلّی چلے جاؤ - اسوقت دلّی میں حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم محمود خاں صاحب کا طوطی بولتا تھا - یہ دلّی پہونچے اور دونوں صاحبوں کو دکھلایا - چنانچہ اُن کے علاج سے کُل فایدہ ہوگیا - پھر یہ پروگرام بنا کہ کچھ دنوں یہاں قیام کیا جائے اور دلی کی سیر کی جائے، اس لئے کہ پہلی بار دلّی آنا ہوا تھا - غرض کہ یہ ٹھہر گئے اور خوب سیر تفریح کی - یہاں جن معزز شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور جن کی پُر بہار صحبتوں سے یہ لطف اندوز ہوئے اُن میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ، نواب ضیاءالدین خاں نیر درخشاں، نواب سعدالدین خاں طالب، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا الطاف حسین حالی اور میرزا اسداللہ خاں غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں - مرزا غالب سے ایک ملاقات کا ذکر کرکے نساخ لکھتے ہیں کہ :- "مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے سات آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہوگے - میں نے کہا ہاں، درعید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی "ابر گہربار" کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے - اس پر اہل دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تو وہ خفا ہوجاتے تھے" یہ واقعہ ۱۲۸۴ھ کا ہے - غرض اس طرح تین مہینے قیام کرنے کے بعد نساخ اپنے وطن مالوف کو واپس آگئے - واپسی میں آگرہ اور کان پور ہوتے ہوئے جب لکھنؤ پہونچے تو سوچا کہ لگے ہاتھوں یہاں کا محرم بھی کیوں نہ دیکھ لیا جائے - محرم کا مہینہ قریب تھا - یہ سوچکر لکھنؤ اتر پڑے اور محرم و تعزیہ داری کا لطف اُٹھایا لکھنؤ میں جن قابل ذکر لوگوں سے ملاقات ہوئی اُن میں آغائی صاحب، داروغہ واجد علی شاہ اور منشی نول کشور خاص ہیں - یہاں نساخ کے اعزاز میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں انھوں نے حسب ذیل غزل سنائی :-

تم وہ ہوشیار ہو کہ ہوشیاروں کو ناداں سمجھو — سمجھے ناداں تمھیں، ناداں نہیں ایسا کوئی
طنز کرتے ہیں عدو میری وفاداری پر، — خوف اس کا نہیں ہوجائے گا رسوا کوئی
پردۂ دیدۂ دل میں ہو تمھیں جلوہ نما، — کیا چھپائیں کہ نہیں آپ سے پردا کوئی
وصل مجھ کو نہ ہوا اور نہ دشمن کو فراق — ہائے نکلی نہ میرے دل کی تمنا کوئی
ظلم کرتے ہو بتو! تم سے خدا سمجھے گا — تم سمجھتے ہو کہ گویا نہیں میرا کوئی
یار و احباب سے نساخ توقع کیسی، — وہ زمانہ نہیں ہووے جو کسی کا کوئی

اس کے چند روز بعد آپ اپنی ملازمت پر واپس چلے آئے۔ مگر ابھی کچھ دنوں قیام کر پائے تھے کہ ۱۸۶۹ء میں آپ کا تبادلہ چھپرہ ضلع سارن ہوگیا اور یہ لدے پھندے چھپرہ پہونچے مگر یہاں بھی چین سے نہ گزری۔ ایک بار تو گنگا کے سیلاب نے پریشان کیا پھر کچھ دنوں بعد اپنے استاد مکرم، حافظ اکرام احمد صاحب ضیغم کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اور پھر چند ماہ بعد خود بیمار پڑ گئے، یہ بیماری پہلی کی بہ نسبت زیادہ سخت اور خطرناک تھی۔ چنانچہ انھوں نے پھر رخصت لی اور چونکہ علاج معالجہ کے معاملہ میں دہلی کے طبیبوں کے معتقد ہوئے تھے اس لئے پھر دہلی کا رخ کیا۔ اللہ نے صحت بخشی اور بعافیت تمام واپس لوٹ آئے۔ اس سفر میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی اور ہوتی بھی کیونکر جبکہ صحبت شب کی جلی ہوئی وہ ایک شمع بھی خاموش ہوگئی تھی۔ غالب کی موت نے ساری بزم کو درہم برہم کرکے رکھدیا تھا۔ بہرنوع جب یہ چھپرہ واپس ہوئے تو ان کا جی وہاں نہ لگا۔ آخر اپریل ۱۸۷۰ء کو انھیں پھر بھاگلپور تبادلہ کر دیا گیا۔ یہاں وہ رہ چکے تھے اور وہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی تھی۔ اس لئے یہ پریشان ہوئے تو ایکے حکام بالا نے انھیں مونگیر بھیجدیا۔ یہاں کچھ چین سے گزری اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی چلا۔ چنانچہ اپنا دیوان دوم موسوم بہ 'اشعار نساخ' اور 'تذکرہ سخن شعرا' یہیں مرتب کیا۔ کچھ شاگرد بھی بنائے۔ جن میں منشی دیانت حسین صاحب فہمی[1] بہاری، شیخ وزیر علی مسلسل[2] اور شاہ خلیل احمد خلیل[3] خاص الخاص اور پیش قابل ذکر ہیں۔ مگر چشم فلک کو، جو کہتے ہیں ہمیشہ سے کور ہے، غریب نساخ کا چین و اطمینان سے بیٹھنا پھوٹی آنکھ بھی نہ بھایا اور ان کو ایسی گردش میں کہ بیچارے سخت پریشان ہوئے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک بار جب ایک نیا حاکم آیا تو دستور کے مطابق دوسرے افسروں کے ساتھ یہ بھی اس کی پذیرائی کے لئے اس کی کوٹھی پر پہونچے۔ شامت اعمال یہ ہوئی کہ یہ انگریز افسران کو پہلے سے جانتا تھا اور ان سے مل بھی چکا تھا۔ اس بنا پر اس کو توقع تھی کہ نساخ اس سے کچھ خاص طور پر ملیں گے۔ ادھر بدقسمتی سے نساخ اس پہلی ملاقات کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور اس انگریز افسر کا حلیہ ان کے ذہن سے اتر چکا تھا۔ اس لئے اوروں کی طرح یہ بھی تکلف سے ملے ایک دن معائنہ میں آیا اور فیصلوں میں نقص نکالنے لگا پھر کچھ فیصلے اپنے دفتر میں منگوائے اور سب میں کچھ نہ کچھ نقص نکال کر ایک سخت قسم کی رپورٹ طیار کی اور حکام بالادست کے پاس بھیجدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو فوراً مونگیر کا چارج واپسی دیدینا پڑا اور سلہٹ چلا آنا پڑا جو نہایت ہی غیر صحت بخش مقام ہے۔ بیچارے نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے بہت ساری تدبیریں کیں مگر کچھ پیش نہ گئی۔

نساخ جہاں جاتے تھے ان کی دو شخصیتیں ہوتی تھیں، ایک بحیثیت افسر ایک بحیثیت شاعر۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ ان کی شاعری کی شہرت خود ان کے پہونچنے سے پہلے یہاں پہونچ گئی۔ اور کچھ روز بعد لوگ شاگردی اختیار کرنے پہونچنے لگے۔ اس گروہ شاگردان میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں ایک حکیم اشرف علی مست اور دوسرے حاجی عبداللہ صاحب آشفتہ۔ مست دراصل حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے مگر چونکہ نساخ سے بھی اچھی خاصی عقیدت تھی اس لئے ان کی شاگردی بھی اختیار کی۔

سلہٹ میں جن صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے مزارات ہیں، ان میں حضرت جلال مجرد یمنی کا مزار سب سے زیادہ مرجع خلایق ہے کہتے ہیں یہ بزرگ حضرت معین الدین اجمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمسفر تھے۔ بہرنوع، ہمارے نساخ کو معلوم ہوا کہ ایک ایسے عالی مرتبہ بزرگ بھی یہاں مدفون ہیں تو اس قدیم عقیدت اور فطری گرویدگی کے سبب جو ان کو صوفیوں اور درویشوں سے تھی، یہ ان کے مزار کی زیارت کے لئے چل پڑے۔ اور جب وہاں پہونچے تو صاحب مزار کے رعب و جلال سے کافی متاثر ہوئے۔

۱۸۷۴ء میں ان کا تبادلہ ڈھاکہ میں ہوگیا۔ اس بار ڈھاکہ میں جن معززین شہر سے ملاقات ہوئی ان میں شاہ ولی اللہ صاحب

---

[1] فہمی، بہار (بہار شریف) کے باشندہ تھے۔ والد کا نام شیخ ہدایت علی تھا۔ جن دنوں نساخ کی پوسٹنگ مونگیر میں تھی، فہمی ٹاؤن اسکول موضع بڑھیا (نواح مونگیر) میں مدرس تھے۔ [2] مسلسل، خاص مونگیر کے باشندہ تھے۔ والد بزرگوار کا نام شیخ زایر علی عرف رمضان علی تھا۔ [3] خلیل، شاہ شرف الدین احمد صاحب یحییٰ منیری معروف بہ مخدوم بہاری کی اولاد میں تھے۔ نساخ جب مونگیر پہونچے تو یہ بار جسٹر مونگیر کے دفتر میں محرر تھے۔

سجادہ نشین اعظم پورہ، نواب عبدالغنی خاں سی، ایس، آئی، نواب احسن اللہ خاں بہادر، مولوی عبیداللہ صاحب عبیدی[1] اور سید محمود صاحب آزاد[2] خاص ہیں۔ اس مرتبہ ڈھاکہ میں یہ دو حضرات ان کے شاگرد ہوئے ایک منشی احمد حسین وافر، دوسرے مولوی عبدالغفور صاحب زایر، وافر مدرسہ محسنیہ ڈھاکہ میں مدرس تھے۔ ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ زایر کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نساخ کی شہرت بحیثیت ایک شاعر اور استاد فن کے مسلم ہوچکی تھی اور کم از کم ارض بنگال میں تو کوئی ان کے جواب نہ تھا۔ ان کے اشعار زبان زد ہوچکے تھے اور انکی غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:-

قابو میں شب وصل میں وہ آئے ہوئے ہیں — منھ فق ہے لٹیں بکھری ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
آنکھوں کو جھکائے ہوئے شرمائے ہوئے ہیں — کچھ بات مرے دل کی مگر پائے ہوئے ہیں
ادنیٰ یہ شگوفہ ہے میرے داغ جگر کا — جو پھول ہیں گلزار میں مرجھائے ہوئے ہیں
شاید دل عشاق سے پھر پیچ کریں گے — گیسو ترے رخسار پہ بل کھائے ہوئے ہیں
گویا دلِ افسردۂ عشاق ہیں اے جاں! — ہاتھوں میں ترے پھول جو کمہلائے ہوئے ہیں
ہنگامہ سا ہنگامہ جو ہے راہ گزر میں — ہمسائے میں شاید وہ کہیں آئے ہوئے ہیں
آجاؤ کہیں جلد خدارا نہ کرو دیر، — ہم جان کو لب پر ابھی ٹھہرائے ہوئے ہیں

گاہے، ہے تسلی تو گہے دیتے ہیں تسکیں
اب تک دلِ نساخ کو بہلائے ہوئے ہیں

انھیں دنوں ان کا دیوانِ سوم موسوم بہ 'ارمغاں' اور 'گنج تاریخ'، جس میں صرف تاریخی قطعات ہیں مرتب ہوکر شایع ہوئیں

---

[1] عبیدی، اگست ۱۸۳۴ء میں ضلع میدنی پور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر مدرسۂ عالیہ کلکتہ چلے آئے اور بقیہ تعلیم کی تکمیل یہیں سے کی۔ اس کے بعد مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ میں بحیثیت مدرس داخل ہوئے اور ترقی کرتے کرتے صدر مدرس کے عہدہ تک پہونچے اور اخیر تک اسی عہدہ پر فایز رہے۔ عبیدی عربی اور فارسی کے ایک جید عالم اور شعر و سخن کے استاد تھے۔ فکر شعر زیادہ تر فارسی ہی میں ہوتی تھی کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کرلیتے تھے۔ ان کا اردو دیوان جو بہت مختصر ہے ۱۸۸۸ء میں شایع ہوچکا ہے۔ کہتے ہیں اس فن میں مولوی عبدالرحیم صاحب تمنا گورکھپوری المعروف بہ عبدالرحیم دہریہ کے شاگرد تھے (دہریہ، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے شاگرد اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم درس تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، بہ روایت ملیح آبادی) مگر نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال ان کو فریاد عظیم آبادی (استاد شاد) کا شاگرد بتاتے ہیں۔ عبیدی نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے اور تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا۔ ان کی کتاب 'مفتاح الادب' جو تین جلدوں میں شایع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تصنیفات کے مالک تھے اور بقول مؤلف 'ارمغانِ پاک' انھوں نے ایک مختصر عمر میں کوئی باون کتابیں تصنیف کیں عبیدی خاندان سہروردیہ کے ایک روشن چراغ تھے۔ ۱۸۸۴ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔ "م، ح"

[2] مولوی سید محمود صاحب آزاد عرف منجھلے سید صاحب، ۱۸۴۳ء کے قریب ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام سید سدیدالدین حیدر تھا۔ جو رؤسائے ڈھاکہ میں اپنا ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ آزاد ایک فطری شاعر تھے اور نہایت پرگو۔ اردو اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی ان کے کلام کا مجموعہ "دیوان آزاد" کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔ پہلے شیدا تخلص کرتے تھے پھر آزاد اختیار کرلیا۔ اردو کلام میں مومن اور غالب کا رنگ نمایاں تھا۔ اساتذہ کے بہت سے اشعار ازبر تھے۔ کہتے ہیں ایک لاکھ چیدہ ابیات کے حافظ تھے۔ فن سخن گوئی میں ضیغم کے شاگرد تھے۔ حضرت غالب سے بھی اصلاح لینے کا موقع ملا تھا۔ ۶۵ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔ ڈھاکہ میں مدفون ہیں۔

"م-ح"

اور انتخاب نقص، جو دراصل میر انیس اور میرزا دبیر کے مرثیوں پر ایک طولانی اعتراض ہے مرتب ہوئی اور انھیں دنوں انھوں نے دہلی کا تیسرا سفر کیا۔ اس بار وہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں شاہزادہ عبدالغنی المعروف بہ مرزا ارشد گورگانی[1] کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پتہ نہ چل سکا کہ اس مرتبہ کس تقریب سے دلی گئے اور کتنا عرصہ وہاں قیام کیا۔ غالباً سیر و تفریح مقصود تھی اور جلد ہی پلٹ آئے۔ بہرکیف! واپسی کے تھوڑے دنوں بعد ۱۸۷۹ء میں ان کا تبادلہ بیربھوم (مغربی بنگال) میں ہوگیا۔ یہاں کے قیام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے اور پھر تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد ان کو ہوگلی بھیج دیا گیا۔ یہاں یہ پہلے (زمانۂ طالبعلمی میں) بھی کافی عرصہ رہ چکے تھے اور یہ کوئی نئی جگہ ان کے لئے نہ تھی مگر مولانا کرامت علی جونپوری کی موت نے یہاں کی علمی و ادبی محفلوں کو ایک گونہ ویران کر دیا تھا۔ اس لئے ہوگلی کچھ اجنبی اجنبی سی لگتی تھی۔ اس مرتبہ یہاں جن لوگوں کے ساتھ ان کی صحبتیں رہیں ان میں مولوی اشرف الدین[2] صاحب متولی ہوگلی امامباڑہ قابلِ ذکر ہیں، جو مولانا کرامت علی کے جانشین تھے۔ کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کی صحت خراب ہونے لگی اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ آخر تنگ آکر تبدیلی کے لئے درخواست کی جو منظور ہوگئی اور جون ۱۸۸۱ء ان کو ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اس بار یہ ڈھاکہ میں کوئی تین سال کے قریب رہے۔ اس عرصہ میں ایک بار ان کی ملاقات مولوی کبیرالدین صاحب اڈیٹر اردو گائیڈ کلکتہ سے ہوئی جو کسی غرض سے کلکتہ سے ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ مولوی کبیرالدین، بہار کی نامور خاتون جمیلہ راضیہ صاحبہ زوجہ مولوی خدا بخش، بانی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ کے والد بزرگوار تھے۔

۱۸۸۴ء میں ان کا تبادلہ میدنی پور میں ہوگیا۔ مگر یہاں کی ہوا راس نہ آئی اور صحت خراب رہنے لگی۔ ایک بار سخت بیمار ہو کر تپ دہائی میں مبتلا ہوگئے اور یہ باعث ہوا ان کے دلی کے چوتھے سفر کا۔ مگر اب تک دلی کافی بدل چکی تھی۔ چنانچہ نساخ نے اس کو محسوس کیا فرماتے ہیں :۔ "قبل ازیں تین بار دہلی گیا۔ اس دفعہ جو دہلی گیا تو دیکھا کہ وہاں کے بعض ہندو اور مسلمان انگریزوں کے کپڑے پہننے لگے ہیں"۔ یعنی انگریزوں کا اثر و اقتدار اچھی طرح نفوذ کر گیا تھا۔ اس سفر دہلی میں ان کی ملاقات نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے ہوئی اور اچھی بے تکلفی ہوگئی۔ وہاں سے واپس آنے پر دسمبر ۱۸۸۵ء میں ان کو پھر ڈھاکہ واپس بھیج دیا گیا مگر ڈھاکہ پہونچنے کے بعد ابھی گرد سفر بھی دامن سے نہ جھڑی تھی کہ جنوری ۱۸۸۶ء میں پھر تبادلہ کی بات چیت ہونے لگی جو بہرحال کسی طرح موقوف ہوگئی اور چند روز بعد اسی مہینہ میں ان کو یہ خوش خبری ملی کہ نواب عبداللطیف خاں صاحب بہادر (نساخ کے سگے بڑے بھائی) کا تقرر بھوپال میں بحیثیت قایم مقام

---

[1] مرزا ارشد گورگانی، خلف مرزا علی بہادر ابن شاہزادہ دلاور شاہ خلف حضرت احمد شاہ بادشاہ دہلی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر سے آپ کا رشتہ یہ ہے کہ آپ نواب کاشفہ سلطان بیگم کے حقیقی نواسے تھے جو حضرت ظفر کی بڑی شاہزادی تھیں۔ مرزا ارشد گورگانی قلعۂ معلیٰ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کے تھے کہ غدر کا واقعہ پیش آگیا اور قلعہ کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ حضرت قطب صاحب میں آرہے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر سررشتۂ پنجاب میں ملازم ہوگئے۔ اس کے بعد ریاست فیروزپور چلے آئے اور فیروزپور کالج میں فارسی کے معلم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ شعر و سخن کی گود میں تو پلے ہی تھے اس لئے اس سے شغف پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس فن میں اپنے ماموں مرزا قادر بخش صاحب المتخلص بہ صابر سے اصلاح لی جو فن شعر و سخن میں اپنے وقت کے ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ مرزا ارشد گورگانی ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا

"م۔ح"

[2] اشرف الدین احمد، متولی امام باڑہ محسنیہ واقع ہوگلی، خلف نواب سید امیر علی خاں بہادر۔ اشرف الدین جنوری ۱۸۵۵ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے ہوگلی کی متولی شپ سے پہلے نواب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے متوسل تھے۔ اور شرافت الدولہ کا خطاب وہیں حاصل کیا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں مولوی کرامت علی کے انتقال کے بعد حکومت نے امام باڑۂ محسنیہ کا چارج ان کے سپرد کر دیا۔ اور یہ اس کے ساتویں متولی ہوئے۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا اور یہ چند رسالے اُن سے یادگار ہیں :۔ (۱) تحفۂ سخن (اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ)، (۲) نورتن (نو فارسی شعراء کا تذکرہ) —— (۳) طبقاتِ محسنیہ (تاریخ امام باڑۂ محسنیہ)۔ (۴) عبرت نامہ۔ (۵) دردانۂ خیال، (۶) یادگار وغیرہ۔

"م۔ح"

وزیر ریاستِ بھوپال ہوگیا ہے - یہ داستان[1] یہاں پہونچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے دو سال بعد ۱۸۸۸ء میں نساخ کا انتقال ہو جاتا ہے، تمام تذکرے نساخ کے اس سال وفات میں متفق ہیں - ان کی خودنوشت سوانح سے ان کی جن تالیفات و تصنیفات کا پتہ چلتا ہے ان میں دفترِ بے مثال - اشعلۂ نساخ - ارمغان - سخن شعراء - گنج تاریخ - چشمۂ فیض اور انتخاب نقص وغیرہ شامل ہیں، مگر ان کے مطبوعہ کلیات اور دیگر تذکروں سے جن مزید تالیفات کا حال معلوم ہوتا ہے اُن میں قطعۂ منتخب - شاہدِ عشرت - زبان رنجتہ - قند پارسی - مرغوب دل - مظہرِ معما - باغ فکر - ترانۂ خامہ اور تذکرۃ المعاصرین کے نام بھی ہیں - اس لحاظ سے ان کی تالیفات کی مجموعی تعداد سولہ تک پہونچتی ہے۔ نساخ کی آل اولاد میں سب سے زیادہ روشن نام ان کے بڑے صاحبزادے مولوی ابوالقاسم محمد صاحب المتخلص بہ شمس کا ہے۔ ان کا تاریخی نام مظہرالحق (۱۲۸۴ھ) تھا۔ شمس نے باپ کی تربیت کے بعد فن شعر و سخن میں سب سے پہلے جن سے اصلاح لی وہ خود ان کے باپ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ صاحب انسخ تھے۔ اس کے بعد داغ کی شاگردی اختیار کی شمس اپنے وقت کے استاد فن تھے اور کئی اچھے شاگرد پیدا کئے جن میں مولانا رضا علی وحشت مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ شمس نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

---

[1] یہ قلمی نسخہ جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے مجھے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخائر کتب میں ملا۔ میں لائبریرین صاحب ایشیاٹک سوسائٹی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس نسخہ سے یہ چند اقتباسات لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اور ساتھ ساتھ اپنے محترم بزرگ مولوی مطیع الرحمٰن صاحب (انچارج اُردو پرشین سیکشن) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس مضمون کی تیاری میں میری مدد فرمائی ہے۔

بعض نایاب کتابیں

(چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے)

کلیات صہبا = (عنقا ر) — قصاید عرفی = (۳۰ ر) — ہشت بہشت = (للعہ ر) — مسطلحات وارستہ = (۵ ر) — مثنوی قران السعدین = (للعہ ر)
کلیات سعدی شیرازی = (۳۰ ر) — غیاث اللغات مع چراغ ہدایت = (۱۵ ر) — گلستان قاآنی = (۵ ر) — بہارستان جامی و لواح جامی = (للعہ ر)
کلیات انشاء اللہ خاں انشاء = (۱۵ ر) — دیوان صحفی = (۵ ر) — دیوان رند = (۵ ر) — تجلائے شہاب ثاقب مع سوانح ثاقب = (معہ ر)
سوانح عمری امیر تیمور و حمیدہ بانو بیگم = (۳۰ ر) — توزک جہانگیری اُردو = (عنقا — حدیقۃ الاولیاء آخر ناقص = (۳۰ ر) — حیات جامی = (۳۰ ر)
ریاض رضوان = (۱۵ ر) — کلیات نظیر اکبر آبادی = (۳۰ ر) — دیوان درد = (عا ر) — انتخاب داغ = (۳۰ ر) — کلیات ولی = (عنقا ر)
کلیات نظیر اکبر آبادی مرتبہ عبدالباری آسی = (۱۵ ر) — صنمخانۂ عشق = (معہ ر) — نظم دل افروز = (۳۰ ر) — دیوان مجروح = (للعہ ر)
آفتاب داغ = (للعہ ر) — ترانۂ یگانہ = (للعہ ر) — گلزار داغ = (عنقا ر) — بہار داغ = (للعہ ر) — یادگار داغ = (معہ ر) —
کلیات میر تقی میر = (معنقا ر) — دیوان ناظم - نواب محمد یوسف علی خاں ناظم رامپوری = (عنقا ر) - کلیات سودا جدید اڈیشن = (عنقا ر)
کلیات میر تقی میر جدید اڈیشن = (عنقا ر) — دیوان بسمل دہلوی = (عنقا ر) — دیوان مہر اثر = (للعہ ر) — مثنوی میر حسن = (۴ ر) —

منیجر نگار لکھنؤ

ادب اور ارتفاع

(سید شبیہ الحسن نونہروی)

اس دُنیا میں علوم وفنون کی ساری ترقیاں، اسی نفسیاتی عمل کی مرہون منت ہیں جسے اصطلاح میں ارتفاع (Sublimation) کہتے ہیں۔ عہد بعہد جن ایجادات اور انکشافات سے انسانی تمدن کو فایدہ پہونچا ہے وہ حقیقتہً فرد اور جماعت کی صلاحیتوں کے زیادہ اچھی راہیں اختیار کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر نفسیاتی قوتوں کے لئے فطرت ارتفاع کے راستوں کو نہ کھول دیتی تو شاید آج دنیا میں کسی تہذیب کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اور انسان جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتا ہوتا۔ وہ مختلف علوم وفنون جن سے آج کا انسان بلا واسطہ یا بالواسطہ فایدہ اُٹھا رہا ہے، دنیا کے وہ ادب کہ جن میں حدیثِ دیگراں کے پردے میں حدیث دل کی گونج محسوس کی جارہی ہے، یا فنون لطیفہ کی وہ ترقی جو احساس جمال کی تشفی وتسکینی کے سامان مہیا کرتی ہے، درحقیقت ارتفاع کی مختلف منزلیں ہیں، جہاں پہونچ کر صلاحیتیں اتنی گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں کہ عام ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے طیار نہیں ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کا منبع ایک ہے بلکہ نوعیت اور قسم بھی تقریباً یکساں ہے۔

یوں تو فرد کے ہر ذہنی اور جسمانی عمل کا تعلق ارتفاع کے اسی خط سے ہے جس کے سہارے اس کی خام صلاحیتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا تھا۔ مگر یہاں ادب اقسام کو چھوڑ کر ارتفاع کی ایک اعلیٰ قسم یا مثال یعنی تخلیقی عمل کا جایزہ لینا ہے اس لئے کہ ادب اسی تخلیقی عمل کی ایک قسم ہے۔

یوں تو ارتفاع کا مسئلہ کافی پیچیدہ ہے اس لئے کہ دو آدمیوں کا ارتفاع اُس میں اسی طرح مختلف ہوتا ہے جیسے ان کے انگوٹھے کا نشان، لہذا ارتفاع کے سلسلہ میں ان کلیات کا وضع کرنا جن کا مختلف افراد کے اوپر اطلاق ہوسکے، ایک محال سی چیز ہے۔ مگر ارتفاع کی نوعیت اور مطلب ومقصد چند مخصوص افراد کا جایزہ لیکر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ جایزہ خواہ کتنی ہی کوشش اور بالغ نظری کے ساتھ کیوں نہ لیا جائے اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ ان لاشعوری محرکات اور عوامل کو بھی نظر میں نہ رکھ لیا جائے جو ارتفاع کے سلسلہ میں اہم کام انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے تحلیل نفسی کے نظریات سے استفادہ کئے بغیر جب بھی ارتفاع کو سمجھنے کی کوشش کی گئی تو وہ زیادہ بارآور نہیں ہوسکی اور اسی لئے تحلیل نفسی کے علم کے وجود میں آنے سے پہلے مختلف فلاسفہ اور مفکرین کے یہاں ارتفاع کے مسئلہ پر جو بھی اظہار خیال ملتا ہے وہ نہ صرف ناکافی ہے بلکہ بڑی حد تک مبہم اور گمراہ کن ہے جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ ایسے تمام لوگ انسانی ذہن کے اس تھیرے ہوئے تالاب میں شست ڈالے بیٹھے رہے جسے شعور کہتے ہیں، انھیں اس پر پے در پے دم گھا گھڑاہٹ رسائی کا موقع نہ ملا جو لاشعور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تحلیل نفسی کے ساتھ جب بھی ارتفاع کا نام آتا ہے تو بعض ذہنوں کو خواہ مخواہ تشویش پیدا ہونے لگتی ہے جس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اعلیٰ ذہنی تخلیقات کی تہ میں لاشعوری محرکات کی کارکردگی کرنے پر ان کا ذہن طیار نہیں ہوتا ہے اور دوسری وجہ جو اس سے زیادہ پریشان کن ہے یہ ہے کہ یہ تصور انھیں انتہائی گھبراہٹ میں ڈالدیتا ہے کہ جن کارناموں پر ہم اپنے دماغی تفوق کی ساری بنیاد رکھتے ہیں وہ جنس ایسی حقیر اور نفرت انگیز چیز پر منتہی ہوں گے۔ ایسے لوگ کبھی کبھی ارتفاع کے مسئلہ کو جنس نہیں بلکہ جنسی فعل

سے مخلوط کر کے اور بھی گھبراہٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ تحلیل نفسی میں جنس کا لفظ ان معنوں میں قطعاً استعمال نہیں ہوتا ہے جو عام طور سے اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ لبائڈو جسے جنسی قوتوں کا مرکز کہا جاتا ہے ان تمام طفلانہ جبلتوں پر مشتمل ہے جو عرف عام والی جنسیت کے آغاز سے بہت پہلے ایک بچے میں موجود ہوتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ عضویاتی جنس کا ارتفاع ایک محال چیز ہے۔ تحلیل نفسی کے سلسلہ میں جب جنسی جبلتوں کے ارتفاع کا مسئلہ اٹھتا ہے تو اس سے جنسی فعل یا جنسی قوت کا ارتفاع مراد نہیں ہوتا بلکہ حیات پرور جبلتوں کا ارتفاع مراد ہوتا ہے۔

اب تک ارتفاع کے بنیادی عناصر پر ماہرین نفسیات کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے اسی لئے ارتفاع کی جو مختلف تعریفیں کی گئی ہیں وہ بھی متفق علیہ نہیں ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ارتفاع ان اعتدال پذیر دبی ہوئی طفلانہ خواہشوں کی نمایندگی کرتا ہے جو ضمیر (Conscience) کے سارے عذر و احتجاج کے باوجود کوہ آتش فشاں کی طرح اُبل کر سطح پر آجاتی ہیں، ماہرین کا ایک دوسرا گروہ بالکل اس کے برعکس اس بات کا مدعی ہے کہ ارتفاع کے ذریعہ سے در اصل باطنی ضمیر کی فتح ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ غیر شعوری خواہشات سے ایک معتدبہ علاقہ چھین کر اس پر زیادہ مفید قسم کی نوآبادیاں قایم کر دیتا ہے۔

ارتفاع کی ایک عام تعریف جو زیادہ قابل قبول ہونے کے علاوہ صحت سے بھی زیادہ قریب ہے حسب ذیل الفاظ میں ہو سکتی ہے :-

"ارتفاع ایک غیر شعوری عمل ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی انرجی طفلانہ اور ممنوع چیزوں سے منتقل ہو کر ان افعال و اعمال کی انجام دہی میں لگ جاتی ہے جو تہذیب و معاشرہ کے لئے پسندیدہ یا مفید ہیں"

فرائڈ کے خیال کے مطابق جبلتوں کا ارتفاع ہمارے کلچر کی ایک بہت نمایاں خصوصیت ہے جس کی بدولت اعلیٰ ذہنی اعمال کو خواہ وہ سائنسی ہوں یا فنکارانہ یا تصوراتی متمدن زندگی میں اہم کام انجام دینے کا موقع ملتا ہے۔

ایک سرجن کی آپریشن میں دلچسپی۔ کسی کا جہاز رانی میں دل لگنا۔ ایک مورخ کا کسی خاص عہد کی تاریخ پر ہمہ تن متوجہ ہو کر تفتیش کرنا۔ کسی فلسفی کا آفاقی مسایل کی گتھیاں سلجھانا اور ایک ادیب کا اپنے فن کے ذریعہ سے نہ صرف تخلیقی جبلت کی تسکین دینا بلکہ سماج اور ملک کو فایدہ پہونچانا وغیرہ یہ سب صورتیں ارتفاع ہی کے ذہن میں آتی ہیں۔

اس موقع پر ارتفاع کے بنیادی لوازم اور خصوصیات سے تھوڑی سی بحث کر لینا ناگزیر ہے تاکہ عام ارتفاع کی وہ مخصوص شکل جو ادبی کارناموں کے ضمن میں جھلکتی ہے زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو سکے۔

انسانی شخصیت (Personality) کے بنیادی محرکات ان مخصوص جبلتوں پر مشتمل ہیں، جنس فطرت زاد راہ کے طور پر فرد کے حوالہ کر کے اسے ترقی و تحصیل کمال کے طویل سفر پر روانہ کر دیتی ہے ان جبلتوں کا ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے جس کا حصول ذہنی آسایش اور تسکین کا سبب ہوتا ہے۔ جبلتوں کا برسر عمل رہنا ایک کشمکش یا تناؤ کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور مقصد کا حصول اس تناؤ اور کشمکش کے ڈھیلے پڑنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کشمکش کا اختتام ایک مسرت بخش تجربہ ہوتا ہے، انسانی جبلتیں بھی تناؤ اور کشمکش کو ختم کر کے مسرت اندوزی کرنا چاہتی ہیں اسی لئے جبلتوں کا رجحان ان ذرائع اور مقاصد کی طرف فطری طور پر ہوتا ہے جو کشمکش کو دور کر کے سامان مسرت مہیا کرنے میں خاص طور سے معاون ہوں۔

ان حیثیتوں کی بہت اہم اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص شے یا موضوع سے اس طرح نہیں چمٹی رہتی ہیں کہ چھٹائے نہ چھوٹیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی مخصوص شے جو کشمکش کو دور کر کے سامان مسرت مہیا کر سکتی ہے فی الحال موجود نہیں ہے تو یہ جبلتیں کسی ایسی دوسری چیز کی طرف منتقل ہو جائیں گی جو دست رس کے اندر ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جبلتوں کے ساتھ جو نفسیاتی انرجی کا ذخیرہ ہوتا ہے وہ انتہائے قابل انتقال ہے۔ اسی لئے جبلتیں صرف نکاسی چاہتی ہیں کسی مخصوص شے کے

ذریعہ سے نکاسی پر مُصر نہیں ہوتی ہیں۔ تحلیل نفسی کی زبان میں نفسیاتی انرجی کا ایک منتہا سے دوسرے منتہا کی طرف متوجہ ہوجانے کا نام انتقال (Displacement.) رکھا جاتا ہے۔ شخصیت کا سارا ارتقا اسی انتقال پر موقوف ہے۔ انتقال کے بعد جبلتوں کے بنیادی مقاصد یا کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے صرف منزل یا نشانہ بدل جاتا ہے۔

مثال کے طور پر انتقال کے ان مختلف مراحل پر غور کیجئے جو "دہنی تسکین" (Oral gratification.) کے ضمن میں سامنے آتے ہیں منہ اور لب انسانی جسم کے حساس اعضاء ہیں جن کا کھانے اور پینے سے مخصوص تعلق ہے۔ بچے کے لبوں کو جب ایک محرک چھیڑتا ہے تو وہ ماں کا دودھ پینے لگتا ہے اس طرح بچہ اگرچہ اپنی بھوک کو مٹاتا ہے مگر چوسنے کا عمل بچہ کے لبوں کے لئے بذات خود مسرت بخش ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بچہ اتنی آسانی کے ساتھ ماں کا دودھ پینا نہ سیکھ سکتا۔ اس طرح بچہ کے لئے لبوں کی گردش بھی شکم سیری کا ایک ذریعہ ہونے کے علاوہ اپنی جگہ پر ایک مستقل ضرورت ہے جو اگر شکم سیری کے ضمن میں پوری نہ ہو تو بچہ اس کی علٰحدہ سے تشفی کرنے پر مجبور ہوگا، اسی بنا پر بعض بچے شکم سیر ہونے کے بعد بھی اپنا انگوٹھا یا کوئی ایسی چیز جو ان کے دست رس میں ہو چوسنے لگتے ہیں، جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے تسکین لب کے طفلانہ ذرایع چھوٹتے جاتے ہیں اور دوسرے معقول یا غیر معقول ذرایع اس کی جگہ لیتے جاتے ہیں مثلاً سگریٹ پینا، لبوں پر زبان پھرانا۔ لپ اسٹک استعمال کرنا، سیٹی بجانا، گنگناتے رہنا، برابر تھوکنا، چومنا وغیرہ تسکینی لب کے بدلے ہوئے ذرائع ہیں جو نفسیاتی انرجی کی انتقالی خصوصیت کی بنا پر معرض وجود میں آتے ہیں اگر یہ انرجی قابل انتقال نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ انسان بڑھاپے تک انگوٹھا ہی چوستا رہتا۔

اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نفسیاتی انرجی کو ایک مرکز سے منتقل کرکے کسی دوسرے مخصوص مقصد کی طرف پہونچانے والے محرکات کون ہیں۔ بعض وہ کون سی قوت ہے جو نفسیاتی قوت کو منتقل کرکے کسی منتخب متبادل شے کی طرف لگاتی ہے انتقال کے وقت انرجی بہک کر کے کسی اور راستے کی طرف چلی جاتی۔ اس راستہ اور منزل کا انتخاب کیونکر ہوتا ہے جس پر اور جس تک انتقال کے دوران میں نفسیاتی انرجی کو چلنا اور پہونچنا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا نام تو سماج اور معاشرہ کا لیا جاسکتا ہے جو ماں باپ اور قریبی اعزہ کے ذریعہ سے انتقال کی مخصوص راہوں کو معین کرتا ہے۔ سماج کچھ چیزوں کی اجازت دیتا ہے اور کچھ کو ممنوع قرار دیتا ہے اس امر و نہی کے ملنے سے ایک مخصوص طرح کا تصوراتی نظام اخلاق و معاشرت معین ہوجاتا ہے اور انھیں بندشوں کے درمیان میں انسانی جبلتیں مسرت اندوزی کے طفلانہ ذرایع کو چھوڑ کر سماج کے کسی مباح کردہ یا پسندیدہ ذریعہ کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں۔

دوسری چیز جو انتقال کی راہوں کو معین کرتی ہے وہ مشابہت اور مماثلت ہے جو جبلتوں کے حصول تسکینی کے قدیم اور اب جدید متبادل ذرایع کے درمیان میں موجود ہوتی ہے، اگر جبلتوں کو کسی مخصوص شے کے ضمن میں تسکین کا سامان نہیں ملتا ہے تو وہ کسی دوسری شے کا انتخاب کریں گی جو اس پہلی شے سے کسی نہ کسی طرح مماثلت رکھتی ہو، اگر یہ دوسری چیز بھی شجر ممنوعہ ثابت ہوئی تو کسی تیسری اور چوتھی چیز کا انتخاب ہوگا یہاں تک کہ مناسب اور موزوں چیز مل جائے۔ انتخاب کا یہ قافلہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا اور ایک کو چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری اور پھر چوتھی اور پانچویں چیز کی طرف بڑھتا جائے اسی کے ساتھ ساتھ ابتدائی سامان تسکین جو انتقال سے پہلے تھا اور آخری منتخب شدہ ذریعہ تسکین (جس کی طرف متعدد چیزوں کو مسترد کرکے پہونچنا ممکن ہوا ہے) میں کافی اختلاف ہوجائے گا۔ انتقال کے وہ مختلف مراحل جن میں ہر مرحلہ کے بعد اصل اور ابتدائی ذریعہ تسکینی سے مشابہت گھٹتی جاتی ہے، حسب ذیل مثال سے ظاہر ہوسکتے ہیں جسے کالون ایس ہال کی تحریروں سے منتخب کیا گیا ہے۔

ایک بچہ کی محبت کا ابتدائی مرکز عام طور سے اس کی ماں ہوتی ہے جسے بچہ ایک مثالی خاتون سمجھتا ہے آئندہ چلکر بچہ ماں میں نہ صرف کمال سے گری ہوئی عادات اور خصایل کو محسوس کرتا ہے بلکہ یہ بھی خیال کرتا ہے کہ اور بھائی بہنوں کی موجودگی میں

کی محبت کا وہ تنہا مالک نہیں ہے دوسروں کی شرکت اس کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے اس احساس سے بچہ میں یقیناً ایک اُلجھن پیدا ہوتی ہے جس سے نجات پانے کے لئے وہ کسی ایسی متبادل ذات کو تلاش کرتا ہے جو صفات کمال پر فایز ہونے کے علاوہ دست رس سے باہر بھی نہ ہو۔ یہ انتخاب ہوسکتا ہے کہ ماں سے منتقل ہوکر کسی اور بزرگ خاتون کی طرف مڑ جائے جو بچے کی عزیز پڑوسی یا استانی ہوں مگر ابھی اُلجھن سے نجات نہیں ہوئی اس لئے کہ ان میں بھی بعد میں چلکر مخصوص کمیاں اور خامیاں محسوس ہونے لگتی ہیں، اب کی دفعہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بڑی لڑکی کو ماں کا بدل قرار دے جو خود اس کی بڑی بہن کی سہیلیوں میں سے کوئی ہو۔ مگر اب بھی اسے کوئی مثالی خاتون نہیں مل سکی اور اس کی بے چینیاں بدستور باقی رہتی ہے تو اس کے بعد ممکن ہے کہ وہ خیالی پلاؤ پکانا شروع کرنے اور اپنے تصور میں کسی پیکر خیالی کی تخلیق کرکے اسے ہر طرح کے بلند صفات اور خصایل سے متصف مان کر اس سے محبت شروع کردے یا عہدِ قدیم کی کسی تاریخی ہیروئن یا موجودہ عہد کے فلمی ستاروں میں سے کسی کو مثالی خاتون سمجھ کر اس سے محبت شروع کردے۔ اب اگر اس میں کچھ صلاحیتیں موجود ہیں اور اس مقصد کے لئے کچھ موزوں تربیت بھی اس کی ہوچکی ہے تو ممکن ہے وہ تصویر بنانا شروع کردے اور اس مثالی خاتون کے خیالی پیکر کو پردۂ تصویر پر منتقل کردے اور اس طرح دُنیا میں ایک اچھے آرٹسٹ کی حیثیت سے نام کرجائے یا وہ شاعری شروع کردے، جس میں کھلے یا ڈھکے انداز میں وہ الفاظ کے ذریعہ سے اس مثالی خاتون کی تصویر کشی کردے جس کی تلاش میں اس کا دل و دماغ عرصہ سے بیچین ہے۔

متذکرۂ بالا مثال میں ارتفاع کی مختلف منزلیں چھوڑتا ہوا بچہ اس آخری منزل پر پہونچا جہاں سے ابتدائی منزل کا اندازہ لگانا بھی اسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے اس لئے کہ ابتداء اور انتہا میں انتقالی قوت کے کثیر مراحل اور منازل کی وجہ سے دونوں میں بہت کم مشابہت باقی رہ گئی ہے۔

نفسیاتی انرجی منتقل ہوکر آخر میں جس مرکز کی طرف پہونچتی ہے اگر وہ تہذیب و اخلاق کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ اقدار کا حامل ہے تو اسی قسم کے انتقال کو اصطلاحاً 'ارتفاع' (Sublimation.) کہا جاتا ہے جس میں جارحانہ اور جنسی جبلتوں کی نکاسی بظاہر ان ذرائع سے ہوتی ہے جو غیر جنسی اور غیر تشدد ی ہوتے ہیں۔ اسی موقع پر فرائڈ نے یہ کہا ہے کہ تمدن کا ارتقاء جبلتوں کی نکاسی کے ابتدائی اور اصلی ذرایع کو دبانے اور برطرف کرنے کی بنا پر ممکن ہوسکا ہے اس لئے کہ ان ذرائع کے دب جانے کے بعد نکاس طلب انرجی نے دوسرے ایسے ذرائع ڈھونڈھ کر منتخب کرلئے جو اصولِ اخلاق و معاشرت کے اعتبار سے زیادہ مفید بلند اور پسندیدہ تھے۔

ارتفاع کے بعد یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نفسیاتی انرجی کو ایسی فراغت بخش نکاسی کا موقع مل جاتا ہے جو جبلتوں کو بالکل مطمئن کردے بلکہ اس کے بعد بھی انرجی کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ بچ رہتا ہے جو اپنی نکاسی کے لئے فرد کو کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے یہی کشمکس عہدِ جدید کے متمدن انسان کے لئے بظاہر ہر طرح کا آرام و فراغت نصیب ہونے کے باوجود گھبراہٹ اور بے اطمینانی کا سبب ہے اور اسی بنا پر انسان ارتقاء کی راہوں پر مسلسل آگے بڑھنے کے لئے جرأت مندانہ اقدام کی ہمت کرتا ہے، اگر ارتفاع کی کسی مخصوص منزل پر نفسیاتی انرجی کی نکاسی مکمل طور پر ہوجائے تو پھر انسان کے لئے ترقی کی کوئی گنجایش باقی نہ رہ جائے مگر ہر منزل پر پہونچنے کے بعد نفسیاتی انرجی کا وہ بچا ہوا ذخیرہ جسے نکاس کا موقع نہیں ملا تھا انسان کو بیچین کرکے اور آگے بڑھاتا ہے۔ دُنیا کا ہر انسان ساری ترقی اور آسایش کے باوجود اینڈ بیچینی محسوس کرتا ہے، یہ بیچینی اسی بچی ہوئی نفسیاتی انرجی کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو فرد کو آگے بڑھا کر بالواسطہ تہذیب و تمدن کی ترقی کا بھی سبب بنتی ہے۔

نفسیاتی انرجی کے قابل انقسام اور لاشخصی ہونے کی بنا پر اس سے گوناگوں کام لئے جاسکتے ہیں۔ جس طرح بجلی کی قوت بنیادی حیثیت سے یکساں اور ایک ہی ہوتی ہے مگر اس سے بیشمار کام لئے جاسکتے ہیں اسی طرح جنسی انرجی کو بھی مختلف الاقسام انسانی افکار و اعمال میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اب اگر یہ کہا جائے کہ مختلف انسانی اعمال جیسے باغبانی۔ انجینرنگ تعلیم صنعت و حرفت،

شاعری، ناول نگاری، خطابت وغیرہ جنسی اور جارحانہ جبلتوں کے ارتفاع کے مختلف مظاہر ہیں تو کچھ زیادہ تعجب نہ ہونا چاہئے

اڈمنڈ برگلر نے فرد کے ارتفاع کی مثال اس طرح دی ہے کہ آپ ایک ایسے خوبصورت گھر کا تصور کیجئے جو عہدِ حاضر کے تمام ترقی یافتہ آرام و آسایش کے سامان سے آراستہ ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈا اور جاڑوں میں گرم رکھنے کا انتظام باقاعدہ ہے ریفریجریٹر بھی لگا ہوا ہے۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل بھی موجود ہیں، بھاپ اور بجلی کی تمام آسائشیں بھی مہیا ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ نہ صرف تمام آرام و آسایش کے ذرائع موجود ہیں بلکہ ہر چیز خود کار آلات کی مدد سے بغیر ظاہری ہنگامہ اور فکر کی ضرورت کے وقت موجود ہو جاتی ہے۔ دیکھنے میں گھر نہایت صاف ستھرا ہر ہر چیز سے سلیقہ اور ذوق کا پتہ چلتا ہے آراستگی اور قرینہ سے باسیوں کے انتہائی مہذب اور متمدن ہونے کا ثبوت ملتا ہے مگر کیا کوئی یہ یقین کر سکتا ہے کہ یہ تمام سب چیزیں بیرونی خلا سے اُتر کر اس گھر میں نازل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام سب انتظامات کے لئے ضروری مشینیں اور آلات اس تہ خانہ میں موجود ہوں گے جو گھر کے نیچے بنا ہوا ہے تہ خانہ کے اوپر گھر میں جو کچھ ہے وہ ہمیں مکمل اور منظم شکل میں نظر آتا ہے مگر اس تکمیل اور انتظام کے سارے مراحل اسی تہ خانہ میں طے ہوتے ہیں جو ہماری نظروں سے غائب مگر گھر کے نیچے موجود ہے۔ گھر کی اوپری دُنیا تو بظاہر بڑی خاموش اور مہذب نظر آتی ہے مگر وہ تہ خانہ جہاں سب انتظام ہوتا ہے ایک چھوٹے سے محشر کی مثال پیش کرتا ہے اس لئے کہ وہاں مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ، کوڑا کرکٹ اور ٹوٹ پھوٹ تمام ہی چیزیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح ایک شاعر نے فرض کیجئے کہ ایک بہت ہی آراستہ اور خیال پرور نظم کہی جو اعلیٰ ادب میں شمار کرنے کے ظاہری اعتبار سے یہ نظم ایسی ہی ہے جیسے کہ اس گھر کی اوپری فضا مگر جس طرح اس گھر کو بغیر اس تہ خانہ کی مدد کے سمجھنا ممکن نہیں ہے اسی طرح اس نظم کا سمجھنا بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس تہ خانہ اور اس کے آلات و رسایل اور خام مواد کو نہ سمجھ لیں جس میں یہ نظم حقیقتہً طیار ہوئی ہے۔

گھر کا یہ تہ خانہ جس کی اوپر مثال دی گئی ہے اپنے تمام مشین اور آلات کے باوجود خود کفیل نہیں ہو سکتا ہے، اس کی مشینوں کو تاروں کے ذریعہ سے اس بیرونی پول سے متصل کیا گیا ہے جہاں سے انھیں کارکردگی کے لئے بجلی ملتی ہے اسی طرح کسی ادب کو سمجھنے کے لئے شاعر یا ادیب کے ذہنی تہ خانہ کا جایزہ لے لینا ہی کافی نہیں ہو سکتا جب تک اچھی طرح یہ بھی نہ تفتیش کر لی جائے کہ اس کے ذہن کی مخصوص کارکردگیوں میں ان قوتوں کا کتنا دخل ہے جو بیرون (سماج) سے منتقل ہو کر اس تک پہونچ رہی ہیں۔

یہ مثال ارتفاع کی تھوڑی بہت وضاحت کرتی ہے مگر مکمل مثال بننے کی اہلیت نہیں رکھتی اس لئے کہ اس گھر میں صرف ایک ہی تہ خانہ ہے جس میں بیرونی آسایش کے لئے سارے انتظامات مکمل کئے جاتے ہیں مگر تہذیبی ارتفاع ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں نیچے اوپر تہ خانوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے اور نفسیاتی انرجی کو ایک طویل سفر کرنے کے بعد اور مختلف کشمکشوں سے دوچار ہو کر کسی مرتفع شکل میں نمود کا موقع ملتا ہے۔

اب آیئے اس کا جایزہ لیا جائے کہ وہ کون سی مختلف تہیں، یا تہ خانے ہیں جن میں نفسیاتی انرجی نکھرتے نکھرتے ادب کے بام بلند تک پہونچتی ہے۔ یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر شخص کا ارتقاء اور ارتفاع الگ ہوتا ہے لہذا اس جایزہ کو ایک عام پیمانہ بنا لینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ہے۔

اسی گھر میں ایک سجا سجایا صاف ستھرا کمرہ ہے۔ جس میں آرام کرسی پر اُردو ادب کا ایک نقاد بیٹھا ہوا کسی کتاب ورق گردانی کر رہا ہے سامنے الماریاں ہیں جن میں رنگ برنگ کی جاذب نظر کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ یہ تنقید نگار اُردو کی صف اول کے نقادوں میں گنا جاتا ہے، مختلف ادبی انجمنوں کے اعزازی ممبر ہیں۔ ملک کی مشہور کانفرنسوں میں اپنے پر زور خطبہ ہائے صدارت اور مضامین پڑھ پڑھ کر بڑی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تقریروں سے گریزاں رہتے ہیں، بالعموم بات بہت کم کرتے ہیں مگر ہمیشہ لکھتے پڑھتے رہتے

ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غور و فکر کی طرف رجحان زیادہ ہے کسی یونیورسٹی میں انگریزی زبان کے پروفیسر ہیں مگر زیادہ تر اُردو میں لکھتے ہیں اب تک متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں، مضامین کی تعداد کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔

کچھ لوگوں کو ان کی تحریروں سے اختلاف بھی ہے اس لئے کہ ان کی تنقیدوں میں عام طور سے جارحانہ رجحان زیادہ پایا جاتا ہے، اُردو زبان کے اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں اپنے علاوہ دوسرے تنقید نگاروں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اور بالعموم اُردو زبان کے تنقیدی اور ادبی سرمایہ کو بے تک اور مہمل سمجھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا شاعر، تنقید نگار یا ادیب چاہے وہ قدیم ہو یا جدید نہیں ہوگا جس کا گہرا مطالعہ انھوں نے نہ کیا ہو۔

اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ہمارے اس نقاد میں ایک کمزوری بھی ہے جس کا نفسیاتی نام اشاعتی جبریت (Publication Compulsion) ہے۔ وہ اپنی تحریروں کی اشاعت میں بڑا اہتمام کرتے ہیں یہ وہ قصہ ہے کہ ان کے مضامین اور کتابیں اپنے اندر افادیت رکھتی ہیں مگر محض ان کی افادیت ہی ان کی اشاعت کی ذمہ دار نہیں ہے۔ ان کا مضمون کس رسالہ میں چھپے گا، ترتیب میں کس نمبر پر جائے گا، کون سا کاغذ استعمال ہوگا، کتابت کیسی ہوگی، چھپنے میں دیر لگے گی یا فوراً چھپے گا اور اسی قسم کے بہت سے مسایل ان کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مضمون یا کتاب چھپ جانے پر وہ مواد کی طرف اتنی توجہ نہیں کرتے ہیں جتنی طباعت پر، کبھی غور سے سواد خط کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھتے ہیں، کبھی ظاہری تزئین پر غور کرتے ہیں، کبھی اُنگلیوں سے چھو کر کاغذ کی چکناہٹ کا جایزہ لیتے ہیں اور پھر پبلشر سے یہ پوچھ لیتے ہیں کہ ہر دوکان پر ان کی کتاب بکنے کے لئے پہونچ گئی یا نہیں، جن لوگوں کے پتے خصوصیت کے ساتھ انھوں نے بتائے تھے انھیں کتابیں روانہ کی گئیں یا نہیں، کتاب کا اشتہار کن کن اخباروں میں چھپ رہا ہے، ریویو کے لئے کہاں کہاں پہونچ چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی اندرونی بیچینی اور خواہش کی بنا پر انھیں نہ صرف تنقید نگاری کا ذوق ہے بلکہ اپنی تحریروں کے چھپوانے اور ان کی وسیع اشاعت کی بھی فکر لگی رہتی ہے۔

اب آپ اس نقاد سے ہمکلام ہونے کے لئے اس کمرہ میں داخل ہوئے مگر چونکہ آپ اُردو ادب سے کچھ ذوق رکھتے ہیں لہذا یہ نقاد معمولی طور سے آپ کی آؤ بھگت کر کے کسی کرسی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کر کے کہے گا "تشریف رکھئے"۔ مسلسل خاموشی کی وجہ سے آپ کو گفتگو کا آغاز کرنا پڑے گا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد آپ اس سے پوچھیں گے کہ اُردو ادب کی طرف آپ کی توجہ کو موڑنے والے اسباب کیا تھے۔ تو وہ ذرا متعجبانہ چہرہ بنا کر آپ کو جواب دیں گے کہ ہر تعلیم یافتہ انسان کے لئے ادب میں دلچسپی لینا ضروری ہے ادب کا مطالعہ درحقیقت انسانی فطرت کا مطالعہ ہے ادب کے ذریعہ سے ہم نہ صرف ابنائے جنس کو پہچانتے ہیں بلکہ دوسری قوموں اور تہذیبوں سے بھی واقفیت پیدا کرتے ہیں۔ ادب اصل میں اس انسانیت کی جلوہ گاہ ہے جو تمام عالم کی ایک مشترک میراث ہے اس کی خوبیوں اور خامیوں کا پرکھنا انسانی نسل کی ذہنی توانائی برقرار رکھنے کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اب آپ تھوڑا اور کریدئے تو وہ فوراً یہ کہے گا نقاص ادب نہ صرف بذات خود لغو چیز ہے بلکہ اس کی لغویت ایک طرح سے متعدی بھی ہے اسلئے کہ لوگ فریب کھا کر اُن اشخاص سے ایک ذہنی ربط پیدا کر لیتے ہیں جنھوں نے ایسا ادب پیدا کیا چونکہ ایسے ادیب ذہنی اعتبار سے مریض ہوتے ہیں ان میں کافی پستی اور خامی ہوتی ہے لہذا نتیجہ میں پورا وہ طبقہ خامکار بن جاتا ہے جو ایسے ادیبوں کو اپنے ذہن و فکر میں ایک مثال کی حیثیت سے جگہ دیدیتا ہے۔ اب آپ اس نقاد کو توجہ دلائیے کہ اصل سوال سے ذرا وہ ہٹ رہا ہے دراصل اسے یہ بتانا چاہئے کہ اُردو ادب کے متعلق جارحانہ رویہ رکھنے کے باوجود اسے اُردو ادب کی تنقید کی طرف توجہ کیونکر ہوئی۔ کیا بچپن میں اس زبان کے سلسلہ میں کوئی غیر خوشگوار واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ کیا اس کے گھر میں مغربیت کا دور دورہ زیادہ تھا جس کی وجہ سے اُردو زبان و ادب کے مطالعہ کا چرچا کم رہتا تھا۔ تو ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دے کہ "جناب آپ کیا باتیں کرتے ہیں اُردو میری مادری زبان ہے، میرے خاندان میں ادبی چرچا کافی رہتا تھا خود میرے متعدد اعزہ نامور شاعر گزرے ہیں۔ میرے دادا صاحب کے وقت سے اُردو

کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ میرے گھر میں موجود ہے جس میں والد صاحب بڑا اضافہ کرتے رہے۔ آپ کو شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں ابھی تنقیدی شعور اچھی طرح پیدا نہیں ہوا ہے یہاں تنقید کا مطلب صرف واہ واہ اور مبالغہ آرائی ہے، آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میری تنقیدیں جارحانہ ہوتی ہیں، میں دراصل سچی بات کہنے کا عادی ہوں، میری تحریروں کی وجہ سے اگر آپ کے صنمکدۂ دماغ میں ہنگامہ برپا ہوتا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ان بتوں کا ہے جنھوں نے آپ کے دماغ میں جگہ حاصل کرلی ہے اور بُرا نہ مانیے گا خود آپ کا بھی قصور ہے ۔۔۔۔۔ اُردو ادب بحیثیت ایک ادب کے ظاہر ہے کہ ابھی اتنا ناپختہ ہے کہ اس میں کسی کو دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ میں نے اس کی خامیوں کو عیاں کرکے بعض مدعیان ذہانت پر یہ روشن کردیا ہے کہ ان میں حقیقتہً کوئی ذہانت موجود ہی نہیں ہے اور ایسے لوگوں کو عریاں کرنا میں سمجھتا ہوں کہ میری اخلاقی ذمہ داری ہے جس کے لئے میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ آپ میری طرف سے شاید شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں، مجھے اُردو ادب یا زبان سے کوئی کد نہیں ہے میں اس زبان کی خدمت کرنا اپنے لئے ایک بڑا شرف سمجھتا ہوں۔ میں تو دراصل ان شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کو ان کی اصلی سطح پر لانا چاہتا ہوں جنھیں غلط قسم کی اہمیت دیدی گئی اور جنھیں دُنیا کے دوسرے عظیم فنکاروں کے مقابل میں لانے کا رواج اُردو داں طبقہ میں ایک مرض کی طرح پھیل گیا ہے۔"

اب اس کے بعد اگر آپ کچھ اور بولے تو ہوسکتا ہے کہ یہ نقاد اکتا کر یہ کہدے کہ جناب میرے پاس فضول باتوں میں ضایع کرنے کے لئے وقت نہیں اور پھر نہایت ہی بے اعتنائی کے ساتھ کسی تازہ وصول شدہ رسالہ کو اُٹھا کر اپنے مضمون پر نظر دوڑانے لگے تاکہ اگر اس میں غلطیاں وغیرہ رہ گئی ہوں تو انھیں درست کرلے اور اگر معیار طباعت وغیرہ ٹھیک نہیں ہے تو اڈیٹر صاحب کو ایک خط لکھ کر تنبیہ کرے اور آیندہ مضمون نہ دینے کی دھمکی دیدے۔

اس ساری گفتگو اور ماحول کو ذہن میں رکھ کر اگر غور کیا جائے تو بہت سی ایسی اہم باتیں اُبھر کر نمودار ہوں گی جو بظاہر غیر اہم معلوم ہونے کے باوجود اس نقاد کے ذہن اور ارتقائی پس منظر کو سمجھنے میں بہت مدد دیں گی۔ نقاد نے گفتگو ختم کرتے کرتے اُردو زبان اور اس کے لکھنے والوں کے درمیان میں ایک معصومانہ فرق کیا ہے جو بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مگر کریدنے پر یہ معلوم ہوگا کہ اس تفریق کی جڑیں اُلجھ کر نہ معلوم کہاں کہاں تک پہونچی ہوئی ہیں۔

ان تمام سب باتوں کا سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ نقاد کے ذہنی نہان خانوں کا ایک تشفی بخش جایزہ نہ لیا جائے اس جایزہ کی ابتدا اس کے ذہن کے سب سے پہلے اور نچلے تہ خانہ سے ہونی چاہیئے جہاں دبی ہوئی قدیم خواہشات اور تاثرات کا ایک بند ذخیرہ ملنے کی امید ہے مگر ہماری توقع کے برخلاف یہاں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آتی ہے جس کا تعلق ادب یا فن تنقید سے ہوسکے۔ کچھ دھندلے دھندلے مناظر ہیں جو تہ خانہ کی تاریکی کی وجہ سے اچھی طرح صاف دکھائی بھی نہیں دے رہے ہیں۔ یہاں منجملہ اور مناظر کے ایک منظر یہ بھی دکھائی دے رہا ہے کہ ایک تین سال کا بچہ (مستقبل کا نقاد) ماں سے شدید وابستگی کی بنا پر اس ڈریسنگ روم میں جھانکنے کی کوشش کررہا ہے جہاں ماں بچے کو اس کی مرضی کے خلاف باہر چھوڑ کر تبدیل لباس کے لئے چلی گئی۔ ماں کو اس معصوم کوشش کا احساس ہوجاتا ہے اور وہ دفعتہً بگڑتی ہوئی باہر نکل آتی ہے اور بچہ کو زوروں میں ڈانٹ دیتی ہے مگر بچہ بجائے مرعوب ہونے کے چند ان جنسی گالیوں کو اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں استعمال کردیتا ہے جن کا ہندوستان کے ہر گلی کوچہ میں رواج ہے، ماں اس پر خفا ہوکر کہتی ہے کہ ٹھہر میں ابھی تیری زبان جلاتی ہوں۔ "جھانکتا ہے پھر گالی بکتا ہے" بچہ گھبرا کر رو پڑتا ہے۔

دوسرے تہ خانہ میں یہ جھانکنے والا بچہ ایک خوفزدگی کی حالت میں ملتا ہے ماحول کی پراگندگی اور ذہنی تشویش کی وجہ سے اسکی کارکردگی کی صلاحیت جیسے ختم ہوگئی ہے اور جیسے ایک باطنی آواز سے ٹھوکے دیرہی ہے "شرم شرم تم محض جھانکنے والے بچے ہو۔ تمھیں اس پر ندامت نہیں محسوس ہوتی" مجبور اور لاچار بچہ ان دلخراش آوازوں کو سن کر تلملاتا ہے مگر بے بس ہوکر خاموش ہوجاتا ہے۔

اب ہم تیسرے تہ خانہ تک پہونچے تو ہمیں اپنی غلط فہمیوں پر حیرت ہوتی جس بچہ کو ہم نے محض بے بس اور لاچار سمجھا تھا وہ پر حرفت نکلا۔ اب وہ غمگین اور آزردہ نہیں ہے بلکہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ گنگنا گنگنا کے اپنا جی بہلا رہا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی بے شرمی کے ساتھ ننگا ہوکر اُچھل کود رہا ہے اور کسی نادیدہ سرزنش کرنے والے کو سنا سنا کر یہ کہہ رہا ہے "مجھ سے تمھاری طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں کیوں جھانکنے لگا۔ میں تاک جھانک کرنے والا لڑکا نہیں ہوں بلکہ میں تو خود اپنے کو دکھا رہا ہوں۔ میں کسی دھمکی کی پروا نہیں کرتا ہوں۔ میں چپکے چپکے گالیاں بھی بک لوں گا ماں نہ سنے گی اور نہ ڈانٹے گی، انھیں غیر شعوری اُلجھنوں میں مبتلا ہوکر بچہ ایک مرتبہ گلی میں جانکلتا ہے اور اتفاق سے کسی بچہ کو فحش زبانی کرتے سن لیتا ہے اور فوراً اس سے یہ کہتا ہے کہ تم چپ رہو ورنہ میں تمھاری زبان جلادوں گا، فحش بکنے والا لڑکا پلٹ کر یہ کہتا ہے کہ ہم تمھاری زبان خود جلادیں گے۔ اور یہ بچہ دفعتہً کسی سوچ میں پڑکر اندر چلا آتا ہے۔

دوسرے اور تیسرے تہ خانوں کے درمیان میں کچھ تعجب خیز چیزیں نمودار ہوئیں بچہ نے ایک باطنی دھمکی کے زیر اثر جھانکنا چھوڑ دیا جس سے اس کی ذہنی تشویش میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ دھمکی نے خواہش کو دبایا جبکہ ذہنی تشویش کی کمی خواہش کے دبنے پر نہیں بلکہ پورا ہوتے ہوئے پر موقوف تھی، لہذا بچہ نے اب اپنے مقصد کو بدل دیا اور بجائے جھانکنے کے اس نے اپنی نمائش شروع کی۔ فحش زبانی کے سلسلہ میں اسے زبان کے جلادئے جانے کا خوف تھا مگر اس نے جب کسی دوسرے لڑکے کو زبان جلادینے کی دھمکی دی تو وہ اُلٹے اسی کی زبان جلادینے کی دھمکی دینے لگا۔ اب بچہ اس سوچ میں پڑگیا کہ گیا کہ کیا میں بھی ماں کی زبان جلاسکتا ہوں؟

چوتھے تہ خانہ میں پھر ہمیں خلاف توقع باتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس تہ خانہ میں کان کو سن کر دینے والے ہنگامے برپا ہیں، جیسے وادی برہوت کی تمام خبیث روحیں مل کر چیخ رہی ہوں اور ضمیر کی محض آواز پھر اس بچہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بُرا بھلا کہہ رہی ہے اور اسے ایک بے وقعت نمائشی غیر مہذب اور جنگلی جانور کہہ کر خطاب کر رہی ہے اور بچہ گھبراہٹ میں کبھی معذرت کر رہا ہے کبھی معافی مانگ رہا، کبھی احتجاج کرتا ہے اور کبھی وعدہ۔ "ارے سنئے سنئے اچھا میں نہ اب جھانکوں گا اور نہ اپنی نمائش کروں گا، اچھا صاحب میں تمام تعلیمی اور تہذیبی قوانین کو قبول کرتا ہوں"۔ مگر وہاں سنتا کون ہے اس لئے کہ اندرونی خواہشات اُبھر اُبھر کر اس زبانی ریاکاری کا پردہ چاک کر رہی ہے۔

نفسیاتی ارتقاء کا یہ مخصوص موڑ بچہ کے لئے نہایت اہم ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حیران کن بھی ہے اس لئے کہ اب اسے مختلف قسم کی کشاکشوں میں مفاہمت کا ایک درمیانی راستہ نکالنا ہے اسے اپنی دبی ہوئی مکروہ اور مستحسن خواہشوں کی نکاس بھی کرتی ہے اور ماحول و تہذیب و تمدن کی پابندیوں کا بھی خیال کرتا ہے، وہ ملزم گردانے والوں کو محض ہاں ہاں سے مطمئن نہیں کرسکتا ہے اسلئے اسے عملاً کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ بچہ نے یہ مان لیا کہ اسے مہذب انسان ہونا چاہئے، لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادب کے مطالعہ اور تعلیم میں اپنا وقت صرف کرے گا۔ وہ انگریزی زبان و ادب کی کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کرے گا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زبان اور ادب کی تنقید بھی خاص طور سے کرے گا۔ یہ تمام سب مراحل اور فیصلے تقریباً غیر شعوری انداز میں چپکے چپکے اس طرح ہوگئے کہ اس بچہ کو باقاعدہ کوئی خبر بھی نہ ہوئی۔

آخری تہ خانہ وہ ہے جس کا دروازہ شعوری دنیا میں کھلتا ہے نہ اس میں کوئی خاص پیچیدگی ہے نہ ہنگامہ، مگر اس میں اسی قسم کی بے ترتیبی موجود ہے جو کسی میک آپ کے کمرہ میں ہوتی ہے اس لئے کہ اسی تہ خانہ میں جمع شدہ خام مواد کی ترتیب و تنسیخ ہوتی ہے اور یہیں دبی ہوئی خواہشات کو علامتوں کا لباس پہنایا جاتا ہے۔ یہیں مکروہ مواد کو درست کرکے اس کے شکل و شمایل کو جاذب نظر بنانے کا کام انجام دیا جاتا ہے تاکہ یہ نگار ذہن جب شعوری دنیا میں پہونچے تو کسی کو عیب جوئی کی ہمت نہ پڑے[1]۔

---

[1] پانچ تہوں یا تہ خانوں کا تصور اڈمنڈ برگر سے ماخوذ ہے۔

اس نقاد کے یہاں مفاہمت کی یہ مخصوص شکل در اصل اسی ردو بدل اور کشمکش کی وجہ سے پیدا ہوئی جو مختلف نہ خانوں سے گزرتی ہوئی اس اہم موڑ پر پہونچ گئی تھی۔ بچّہ ماں کی زبان نہیں چلا سکتا تھا مگر اس نے بار بار "مادری زبان" کی لفظ سنی اور ماں کی گوشت و پوست والی زبان چلانے کے بجائے اس بولی جانے والی زبان کی طرف اس کی جارحیت منتقل ہوگئی اور اسی بنا پر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مہارت کسی غیر ملکی زبان میں حاصل کرے گا۔ مگر پھر وہ یہ سوچ کر چونک جاتا ہے کہ مجھ سے دراصل ماں کو تکلیف پہونچانی تھی نہ کہ اس بولی جانے والی زبان کو، لہذا اس نے ان بڑے شاعروں اور ادیبوں اور نقادوں کو اپنی جارحانہ تنقید کے لئے منتخب کرلیا جو اس زبان کے اساطین میں سمجھے جاتے ہیں اور بجائے واقعاً ان فنکاروں کی زبان چلانے کے ان کے ملفوظات اور ادب پاروں پر جارحانہ نکتہ چینی شروع کردی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نقاد نے اپنی گفتگو ختم کرتے کرتے زبان اور اس کے مصنفین میں تفریق کردی تھی۔

جھانکنے کا عادی وہ اب بھی ہے مگر اب جھانکنے کی عادت مطالعہ میں تبدیل ہوگئی ہے اگر وہ کثرت سے مطالعہ نہ کرے بعض کتابوں میں نہ جھانکے تو ظاہر ہے کہ وہ تنقیدیں کیونکر کرسکتا ہے۔ نمائش کی عادت اس کو اب بھی ہے اس لئے کہ اگر وہ اپنی تحریروں کو نہ چھپوائے تو دوسروں کو ان سے فایدہ ہی کیا پہونچے گا۔ اشاعت میں دلچسپی لینا نمائشی رجحان کی مرتفع شکل ہے۔

اس طرح اس بچّہ نے اپنی پرانی اور دبی ہوئی خواہشات کو علامات کے پردوں میں چھپا کر پورا کیا اور طفلانہ اور ممنوع قسم کے رجحانات کو رفتہ رفتہ ان افعال و اعمال میں تبدیل کردیا جو سماج اور معاشرہ کے نزدیک ممدوح اور پسندیدہ ہیں اور اب جب ہم ان نہ خانوں کی سیر کرتے ہوئے سطح کے اوپر آتے ہیں تو وہاں بھی بچّہ بین ایک نقاد اور معلّم کی حیثیت سے ایک کمرہ میں ملتا ہے اور شاید اپنی کسی ایسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہے جو ابھی ابھی چھپ کر ملی ہے۔ ایک جھانکنے والا نمائشی بچّہ آخر کار ایک بڑا اور اہم نقاد بن گیا۔ مگر وہ ان جبلتوں سے دامن نہیں چھڑا سکا جو ابتدائے آفرینش سے اس کے لاشعور میں برسرِ عمل تھیں۔ شعوری طور پر وہ اب بھی نہیں بتا سکتا کہ اس منزل پر پہونچنے میں کن کن موقعوں پر اور کن کن قوتوں نے اس کی دستگیری کی ہے مگر اس کا نفسیاتی جایزہ اس کی ساری کائنات راز کو آسانی کے ساتھ سامنے لے آئے گا۔

کسی زمانہ میں ماہرین نفسیات کا ایک عام خیال یہ تھا کہ ابتدائی جبلتوں کا براہ راست ارتفاع ہوتا ہے اسی لئے نفسیات کی قدیم کتابوں میں اس قسم کے فقرے برابر ملتے ہیں کہ ایک وہ بچّہ جس نے اپنے سادیتی رجحانات پر فتح پالی ہو، آیندہ جل کر مخصوص حالات کے زیر اثر ایک اچھا سرجن یا ایک عمدہ جنگجو سپاہی بن سکتا ہے اسی طرح ایک وہ بچّہ جس نے اپنے نمائشی رجحانات پر قابو حاصل کرلیا ہو آیندہ چلکر ایک اچھا خطیب، مقرر یا ایکٹر بن سکتا ہے۔ مگر اب یہ بات طے شدہ ہے کہ جبلتوں کا براہ راست ارتفاع ممکن نہیں ہے۔ قدیم ماہرین ایک دفاعی ترکیب ہے (Defence mechanism.) اگرچہ آگے بڑھ کر یہی دفاعی ترکیب فرد میں "حملہ آوری" کی استعداد پیدا کرتی ہے مگر اس کی حیثیت ایک بالائی ڈھانچہ کی ہے بنیاد کی نہیں ہے۔

ارتفاع کا ایک دفاعی تدبیر ہونا اس مثال سے ظاہر ہے جس کا تذکرہ اوپر گزرا ہے ایک جھانکنے والا بچّہ جب ڈانٹ دیا جاتا ہے تو وہ نمائشی بن جاتا ہے اس کا نمائشی بننا جو ارتفاع کی طرف پہلا قدم ہے، درحقیقت ایک مدافعانہ تدبیر ہے جس سے وہ اپنے ضمیر کی بیچینی پر (جو ڈانٹ دینے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی) فتح حاصل کرلیتا ہے۔ مگر بعد میں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ نمائشی رجحان بھی کوئی اچھی چیز نہیں ہے اس لئے کہ یہ غیر سماجی اور غیر اخلاقی فعل ہے تو اب وہ ایک دوسری مدافعانہ ترکیب ایجاد کرتا ہے اور ادب و تنقید کی طرف مایل ہوجاتا ہے جو اس کے ارتفاع کی صحیح منزل ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ ارتفاع محض مدافعانہ ترکیب نہیں ہے بلکہ ثانوی مدافعانہ ترکیب اس لئے کہ اس بچّہ کی پہلی مدافعانہ ترکیب نمائشی رجحان تھا مگر جب یہ دفاعی تدبیر خود ہی ایک جرم بن گئی تو اب اس کا دفاع ضروری ہوا اس دفاع کی تکمیل ادب اور تنقید میں پناہ لے کر ہوئی لہذا ارتفاع محض ثانوی دفاعی تدبیر بھی نہیں ہے بلکہ قدیم دفاعی ترکیب کا دفاع ہے (Defence againsh the defence.) یعنی دفاع کا دفاع ہے۔

دفاع خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو مقاومت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور مقاومت کے لئے بھی ایک ایسی قوت (جارحیت ؟) درکار ہوتی ہے جو ناپسندیدہ چیز کو ڈھکیلنے میں مدد دے سکے۔ لہٰذا ارتفاع کا ایک دفاعی چیز ہونا بذات خود اس بات کو چاہتا ہے کہ فرد میں کوئی ایسی قوت یا جارحانہ رجحان موجود ہو جو دفاعی تدبیر کو برسرِ عمل لاسکے۔ کسی بھی جنگ میں دفاع کا پلان بنا لینے سے مصیبت نہیں ٹلتی ہے جب تک کہ قوت اور شدت کے ساتھ دفاعی تدابیر کو عمل کا جامہ نہ پہنا دیا جائے۔ ارتفاع باوجود ایک دفاعی ترکیب ہونے کے عملاً اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ فرد میں کسی ایسے جارحانہ رجحان (Aggression.) کا وجود نہ مان لیا جائے جو بھی دفاعی مشین کو متحرک کرنے میں مدد دے سکے۔ یہیں سے قدیم ماہرین نفسیات کی کوتاہیوں کا راز عیاں ہوتا ہے، انھوں نے ارتفاع کے سلسلہ میں محض لبائڈو (Libido.) حیات پرور جبلتوں پر نظر رکھی اور اسی کے سہارے ارتفاع کی ساری منزلوں کو روشن کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ اس جارحانہ قوت (Aggression.) سے شاید واقف نہ تھے جس کے بغیر ارتفاع کا کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔

ان ساری غلط فہمیوں کی بنیادیں محض دو تھیں ایک تو یہ یقینی کہ جبلتوں کا ارتفاع براہِ راست ہوتا ہے اور دوسرے محض لبائڈو پر اعتماد۔ اب یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ ارتفاع چونکہ دفاعی تدبیر ہے لہٰذا جبلتوں کے براہ راست ارتفاع کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے اور نہ محض لبائڈو کے ایک پہیہ پر ارتفاع کی گاڑی آگے بڑھ سکتی ہے جب تک کہ اس میں جارحانہ رجحان (Aggression.) کا دوسرا پہیہ نہ جوڑا جائے۔

ہر فرد میں جارحانہ رجحانات اسی طرح ابتدائے آفرینش سے موجود ہوتے ہیں جس طرح حیات پرور جبلتیں مگر ارتفاع کے سلسلہ میں اصلی جارحانہ رجحانات کو کارکردگی کا موقع نہیں ملتا ہے اس لئے کہ ارتفاع حملہ نہیں ہے بلکہ مدافعت ہے، تشدد حملہ اور مدافعت دونوں میں ہوتا ہے مگر دونوں جگہ نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ہے حملہ میں اصلی اور واقعی تشدد ہوتا ہے مدافعت میں "نقلی تشدد" ہوتا ہے۔ اسی لئے ارتفاع کے سلسلہ میں جب تشدد کا لفظ آتا ہے تو اس سے اصلی کے بجائے نقلی تشدد (Pseudo aggression.) مراد ہوتا ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نقلی تشدد بذات خود کوئی مستقل اور علٰحدہ چیز ہے۔ فرد میں نقلی تشدد (دفاعی تشدد) کی ساری قوت اسی اصلی تشدد کے حاصل ہوتی ہے جو ایک جبلت کے طور پر دلالت کے وقت ہی سے اس میں موجود ہوتا ہے۔

ارتفاع کے ان دونوں عناصر کی ادب میں آسانی کے ساتھ نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ معیاری ادب کی ہر صنف میں طاؤس و رباب کے نغموں کے ساتھ شمشیر و بستاں کی جھنکار موجود رہتی ہے۔ ادیب حیات اور سماج کو توانا اور برتر بنانا چاہتا ہے مگر اس لئے محض نقطۂ نظر کافی نہیں ہوتا ہے اس کا درس حیات اس وقت تک مکمل اور موثر ہی نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے لہجہ میں ایک ہمہمہ اور بلند آہنگی نہ پیدا کرے، ادب میں حیات پروری کے ساتھ ساتھ ایک تیکھا پن ملتا ہے، یہ حیات پروری اور تیکھا پن ارتفاع کے انہی دونوں عناصر کی بنا پر معرض وجود میں آتے ہیں جن کا نام حیاتی اور تشددی جبلت ہے۔

"من و یزداں"

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیلِ انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو انسانیت کبریٰ دعوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذہب کی تحقیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

آرامگاہِ مرزا بیدل

(ڈاکٹر عبدالغنی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

جب اورنگ زیب عالمگیر دکن میں مصروف جہاد تھے تو نواح دہلی میں سخت فساد برپا تھا، اس وقت بیدل اپنے اہل و عیال سمیت متھرا میں قیام پذیر تھے (جس کا نام اورنگ زیب نے اسلام آباد رکھا تھا) اپنی بقیہ زندگی وہیں بسر کرنے کا تہیہ کئے تھے۔ یہاں کی سرزمین سے بیدل کو بہت محبت تھی، چنانچہ وہ متھرا کے متعلق لکھتے ہیں :-

در زمینیکہ محبت اثرے کاشتہ است
گرد او خرمن چندیں طپش انباشتہ است

لیکن جب ہندو جاٹوں کا تعصب بڑھا تو بیدل کی یہ رواداری اور وسیع المشربی کام نہ آئی اور آخر کار وہ اپنے اہل و عیال سمیت گھر کا اثاثہ کرایہ کی بہلیوں پر لاد کر عازم دہلی ہوئے اور اپنے کنبہ کے ساتھ ۲۷ جمادی الآخر ۱۰۹۶ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۶۸۵ء کو دہلی پہونچے یہاں پہونچکر انھوں نے اپنے محب نواب شکراللہ خاں کو ایک رقعہ لکھا جو ان دنوں بیراٹ کی طرف جاٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھے۔ اس واقعہ میں انھوں نے متھرا چھوڑنے کے اسباب بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ اب زندگی کے باقی دن دہلی ہی میں گزارنے کا ارادہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مکان لب دریا مجھے مل جائے جو شہر سے دور پُرسکون جگہ پر واقع ہو۔

سید نواب شکراللہ خاں اور ان کے تینوں فرزند نواب لطف اللہ خاں، نواب شاکر خاں اور نواب کرم اللہ خاں، بیدل کے بڑے عقیدت مند تھے۔ اس لئے نواب شکراللہ اور ان کے فرزند نواب شاکر خاں نے بیدل کے لئے دہلی میں ایک نہایت موزوں مکان تلاش کرلیا، چنانچہ اُن کے عزیز شاگرد اور رفیق بندرابن داس خوشگو اپنے سفینہ میں لکھتے ہیں :-

"بدارالخلافۂ شاہجہاں آباد رسیدہ گنج عزلت گزید۔ نواب شاکر خاں و نواب شکراللہ خاں بیرون دہلی دروازہ و شہر پناہ در محلہ کھیکریاں برکنار گزر گھاٹ لطف علی حویلی مبلغ پنج ہزار روپیہ خریدہ نذر نمود۔ دو روپیہ یومیہ مقرر کردند کہ تا روز مرگ بہ ایشاں می رسید۔ بقیہ عمر دوران مکان بفراغ سی و شش سال اوقات عزیز بسر برد۔"

خوشگو کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ بیدل نے اپنی زندگی کے باقی چھتیس سال اسی مکان میں بسر کردئے۔ یہ امر تعجب انگیز نہیں، کیونکہ وہ اس سے پہلے پورے اکتیس سال شمالی ہند کے مختلف شہروں میں چکر لگاتے رہے تھے اور متواتر سفر کی وجہ سے اب وہ تنگ آچکے تھے اس لئے جب ایک پرسکون گوشہ انھیں میسر آیا تو پھر وہاں سے عرصہ تک ہلنے کا نام نہ لیا۔ لیکن جب سادات بارہہ نے فرخ سیر کو عذاب دے کر ۱۱۳۱ھ میں قتل کردیا اور بیدل نے بصد اندوہ و ملال یہ تاریخ کہی :-

دیدی کہ چہ باشہِ گرامی کردند — صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود — سادات بہ وے نمک حرامی کردند

تو سادات بارہہ اُن کے مخالف ہوگئے اور یہ خوفزدہ ہوکر ۷۰ سال کی عمر میں نواب عبدالصمد خاں کے پاس لاہور چلے گئے اور جب بتاریخ ۶ ذی الحج ۱۱۳۲ھ (۹ اکتوبر ۱۷۲۰ء) امیرالامراء سید علی حسن خاں بارہہ دکن میں مارے گئے اور سادات بارہہ کا اقتدار ختم ہوا تو

محمد شاہ رنگیلے کا تخت و تاج محفوظ ہوگیا اور بیدل واپس شاہجہاں آباد ہوئے۔ لیکن غالباً صعوبت سفر نے اُن کی توانائی کو ختم کردیا تھا اس لئے مراجعت کے چند روز بعد تپِ محرقہ کے عارضہ سے جمعرات ۴ صفر ۱۱۳۳ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۷۲۰ء کو وہ راہی ملکِ بقا ہوگئے۔ خوشگو کہتے ہیں :۔

"قصہ مختصر در سال ہزار و سی و سوم در ایامیکہ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ پادشاہ غازی برسادات بارہہ مظفر و منصور شدہ ..... حضرت بیدل را در ماہ محرم عارضۂ تپ روئی داد۔ ... یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر شش گھڑی روز برآمدہ ہمائے روح پرفتوح آں زندہ بعیش سرمدی از آشیانۂ تن بال و پر افشاندہ برساکنان عرش معلیٰ سایہ انداخت و بوصال حقیقی کامیاب گردید۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

خوشگو نے اس موقع پر دو تاریخیں کہیں۔ ایک مادۂ تاریخ یہ تھا :۔

یوم پنجشنبہ چہارم ماہِ صفر

اور دوسری مندرجۂ ذیل رُباعی تھی :۔

افسوس کہ بیدل از جہاں روی نہفت — واں جوہر پاک در تہِ خاک بخفت
خوشگو چو ز عقل کرد تاریخ سوال — از عالم رفت میرزا بیدل ۔ گفت

سراج الدین علی خاں آرزو، عطاء اللہ عطا اور دیگر شاگردانِ بیدل نے بھی تاریخیں کہیں۔
میرزا مرحوم کو ان کی خواہش کے مطابق ان کے صحن خانہ ہی میں دفن کیا گیا۔ خوشگو کہتے ہیں :۔

"در ہماں حویلی کہ چبوترہ برائے قبر از مدت دہ (۱۰) سال راست کردہ بودند بخاک سپردند"

خوشگو کے اس بیان کی تائید تمام تذکرہ نویس کرتے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جو ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے بیدل کے ہمعصر ہیں اپنے تذکرہ سرو آزاد میں تحریر کرتے ہیں :۔

(بیدل) در صحن خانۂ خود مدفون گردید۔

۔ انند رام مخلص جو بیدل کے شاگرد تھے اور ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوئے اپنے قلم سے ایک تحریر چھوڑ گئے ہیں جو مولانا ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کے پاس ہے اور اس میں بھی درج ہے کہ :۔

"در سال یک ہزار و یک صد و سی و سہ دولیت حیات سپردند و در صحن حویلی قبر ایشاں است"

حسین قلی جان عظیم آبادی نے اپنا تذکرہ نشترِ عشق ۱۱۳۳ھ میں مکمل کیا تھا، وہ بھی رقمطراز ہیں :۔

"(بیدل) در صحن مکان خودش برلب چمن مدفون شد"

مندرجۂ بالا بیانات سے مزار بیدل کا محل وقوع متعین ہوجاتا ہے۔ دہلی دروازہ اور شہر پناہ کے باہر، دریائے جمنا کے کنارے کھیکریوں کے محلہ میں لطف علی کی حویلی کے صحن میں بیدل دفن ہوئے۔

بیدل کی وفات دارالخلافہ دہلی کا کوئی معمولی سانحہ نہ تھا، امراء، شعراء اور عوام الناس میں ایک تہلکہ بپا ہوگیا اور انھوں نے بیدل کی یاد کو مجالس عُرس کے ذریعہ سے تازہ رکھنے کا تہیہ کرلیا اور عرصہ تک عرس کی تقریب جاری رہی۔ اور خوشگو نے ان مجالس کا تذکرہ بھی مرتب کیا۔ عرس کے سلسلہ میں اُن کے ماموں زاد بھائی میرزا عباد اللہ کے فرزند میرزا محمد سعید کو بیدل کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا اور اس طرح ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوگیا جسے دہلی کی علمی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

بندرابن داس خوشگو کہتے ہیں کہ :۔ "عرس کے موقع پر کلیات بیدل مزار کے پہلو میں رکھدیا جاتا تھا (جسے خود بیدل نے اپنی زندگی میں لکھوایا تھا) اس میں ننانوے ہزار شعر درج تھے اور وزن ۱۴ سیر تھا۔ کلیات کے ساتھ قبر کے پہلو میں، تبرک کے طور پر بیدل کا عصا

بھی رکھا جاتا تھا۔ عصا کا نام بولاس تھا جس کا مطلب ہے شاخ نازک۔ اس کا وزن ۳۶ سیر شاہجہانی تھا اور مضبوط لوگ بھی دونوں ہاتھوں سے بہ مشکل اُٹھا سکتے تھے۔

افتتاح عُرس یوں ہوتا تھا کہ پہلے کلیات بیدل سے ایک غزل پڑھی جاتی تھی اور پھر تمام شرکاء باری باری اپنا تازہ کلام سناتے تھے سفینۂ خوشگو نے ہمیں ۱۱۴۳ھ تک کے اس عُرس کے حالات سنائے ہیں۔ اب آگے بڑھئے۔ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر نادر شاہ حملہ آور ہوا۔ محمد شاہ رنگیلے کی بے بسی، دہلی کا قتل عام اور دارالخلافہ کی لوٹ کھسوٹ ہر ایک کو معلوم ہے۔ ان روح فرسا ایام میں نظام الملک آصف جاہ، دکن سے دہلی آئے۔ ان کے ساتھ اُن کا ایک جواں سال درباری نواب درگاہ قلی خاں بھی تھا۔ نواب موصوف کے حالات خزانۂ عامرہ، گل رعنا اور تذکرۂ بے نظیر میں درج ہیں۔ یہ تلوار کے دھنی ہونے کے علاوہ اُردو اور فارسی کے صاحب ذوق شاعر بھی تھے۔ چنانچہ دہلی کی اس وقت کی مجلسی زندگی اور معاشرت کے متعلق انھوں نے ایک کتاب بھی فارسی زبان میں مرقع دہلی کے نام سے لکھی۔ وہ خود شاعر تھے اور ان کے مخدوم نظام الملک آصف جاہ شاعر ہونے کے علاوہ بیدل کے تلمیذ بھی تھے اس لئے قدرتی طور پر دونوں نے عرس بیدل سے دلچسپی کا اظہار کیا۔

نواب درگاہ قلی خاں مزار بیدل کے متعلق ایک عجیب فقرہ لکھتے ہیں :-

"تربت موزوں ایشاں در دہلی، کہنہ در محوط مختصر بہ رنگ معنی خاص در الفاظ رنگیں واقع شدہ"

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲ صفر کی تیسری تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے، بیدل کے تلامذہ اور شہر کے تمام موزوں طبع لوگ اُن کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ قبر کے اردگرد مجلس ترتیب دی جاتی ہے۔ اُن کا کلیات جو بڑا خوشخط لکھا ہوا ہے حلقہ کے درمیان رکھ لیا جاتا ہے شعر خوانی کا افتتاح اسی میں سے ہوتا ہے۔ کلیات کے عنوان پر مندرجۂ ذیل رُباعی مرقوم ہے :-

اے آئینہ طبع تو ارشاد پذیر — در کسب فواید نہ نمائی تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلائے عام است — سیری کن و سمت تسلی بر گیر

اس کے بعد تمام شعراء کی طرف سے علیٰ قدر مراتب اپنے تازہ افکار حاضرین مجلس کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ غزلخوانی کی ابتداء بیدل کے شاگرد رشید معنی یاب خاں کے کلام سے ہوتی ہے اور :-

"حلاوت طرفہ بحصول می پیوندد انبساط خاص بحضار عاید می گردد"

نواب صاحب مزید لکھتے ہیں کہ بیدل کے برادر زادہ محمد سعید جو معنی بیگانہ کی طرح میرزا کی نسبت معنوی سے بیگانہ ہیں حاضرین مجلس کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کا انتظام کرنے میں بڑی مستعدی اور عرقریزی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرزا محمد سعید کی معیشت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کا تمامتر دارومدار ان معجونوں اور حبوب کی فروخت پر ہے جن کی اختراع میرزا بیدل نے کی تھی، جو از قبیل کیمیا ہیں اور دہلی بھر میں انگشت نما۔

اسی سلسلہ میں معنی یاب خاں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان کا پورا نام گل محمد معنی یاب خاں تھا اور تخلص شاعر۔ آزاد بلگرامی اور خوشگو نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ انھیں بیدل کے شاگردوں میں امتیاز حاصل تھا۔ میرزا کو اُن سے بڑی محبت تھی۔ میرزا کی وفات کے بعد معنی یاب خاں اُن کے متعلقین کی خدمت بڑی باقاعدگی سے کرتے رہے۔ جب تک زندہ رہے ان کی وجہ سے میرزا کے عُرس کا ہنگامہ پوری طرح گرم رہا۔ ان کی وفات ۱۱۵۷ھ میں ہوئی۔

عُرس بیدل کے سلسلہ میں نواب درگاہ علی خاں نے سراج الدین علی خاں آرزو کا بھی ذکر کیا ہے جو عرس کے روز بیدل کی نسبت شاگردی کی بنا پر خاص طور پر شرکت کرتے۔ خود خان آرزو نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں عرس بیدل کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

"کلیاتش روز وفات او کہ چہارم از شہر صفر باشد وہمیں تاریخ وفات اوست و مردم ہندوستان آں آرزو چراغاں

کنند و طعام پختہ بخلائیق دہند و عرس نامند پیوستہ زیارت کردہ می شود"۔

بیدل کے ایک اور ممتاز شاگرد انند رام مخلص بھی عرس کا ذکر اپنی مذکورۂ بالا تحریر میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"قبر ایشاں زیارتگاہ معتقداں و ہر سال محفل عرس منعقد می شود"۔

بہرحال بیدل کے شاگردوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی عُرس کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اُن کے سجادہ نشین محمد سعید کا ذکر پھر کوئی تذکرہ نگار نہیں کرتا۔ غالباً فوت ہو گئے ہوں گے یا کہیں چلے گئے ہوں گے۔ بیدل کی اولاد میں سے میرزا فضل اللہ کا ذکر ضرور مجموعۂ نغز میں ملتا ہے جو پانی پت کے متوطن تھے۔ ممکن ہے میرزا محمد سعید یا ان کے اخلاف دہلی کے سیاسی انقلابات سے ڈر کر پانی پت ہجرت کر گئے ہوں۔ بہرحال جہاں تک عُرس کا تعلق ہے یہ کم بیش مزید بیس سال تک ضرور جاری رہا۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے "تذکرۂ خزانۂ عامرہ" میں بھی۔ اس میں وہ عُرس بیدل کا ذکر کیا ہے۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہ کی تاخت کے بعد بھی بزم دہلی منتشر نہ ہوئی اور یہ المناک صورت حالات اُسوقت پیدا ہوئی جب نادر شاہ کے بیس بائیس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر پے در پے حملے شروع کئے اور سلطنت دہلی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مغل امراء ہوس اقتدار میں باہم دست و گریباں ہوئے۔ مرہٹہ گردی شروع ہو گئی۔ رہیلوں نے طوفان بدتمیزی بپا کیا اور انجام کار غلام قادر رہیلہ نے امیر تیمور کے فرزند شاہ عالم ثانی کی آنکھیں ظالمانہ طور پر نکلوا دیں۔ اور تیموری مخدرات کو عریاں تن ناچنے پر مجبور کیا۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا۔ اور میر تقی میر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں شرفاء مفلوک اور تباہ ہو گئے اور خدا جانے کتنے لوگ پریشان ہو کر دلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ حالات حد درجہ ناسازگار تھے، لیکن عُرس بیدل پھر بھی منعقد ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک بار عُرس بیدل کے موقع پر مولانا ندرت نے میرزا سودا کی ہجو میں ایک فارسی غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا :۔

خون معنی تا رفیع بادہ پیما ریختہ　　آردی ریختہ از جوش سودا ریختہ

میرزا سودا نے اس غزل کو مخمس کر کے ندرت کشمیری پر الٹ دیا، اس میں عرس بیدل کا بھی ذکر ہے :۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو　　بحر میں جس کی ہر طرح شعبۂ خاص و عام ہو

بہرحال ان حالات سے ظاہر ہے کہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ء) تک عُرس بیدل منایا جاتا تھا۔

بیدل مستقل طور پر سکونت پذیر ہونے کے لئے ۱۰۹۶ھ میں دہلی وارد ہوئے اور ۱۱۳۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ یعنی پورے ۳۷ سال تک مسکن بیدل کی دلدادگان شعر و سخن کا مرجع بنا رہا۔

اگر ہم میرزا سودا کے دہلی چھوڑنے کے سال کو عرس بیدل کا آخری سال فرض کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۵۲، سال کے طویل عرصہ تک مزار بیدل شعرائے دہلی کی تربیت گاہ بنا رہا۔ اور ۱۰۹۶ھ سے لے کر ۱۱۸۵ھ یعنی کوئی نوے سال تک شعر و سخن کے لحاظ سے بیدل کے اثرات باقاعدگی سے نفوذ کرتے رہے۔

بیدل فارسی زبان کے شاعر تھے اور بہار میں رہتے تھے لیکن عہد طفولیت ہی میں زبان اُردو سے آشنا ہو چکے تھے۔ وہ ۱۰۷۵ھ میں ۱۲ سال کی عمر میں بہار کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے دہلی کی طرف آ گئے۔ لیکن ان کی تحریرات ثابت کرتی ہیں کہ اس زبان سے وہ بہار ہی میں متعارف ہو چکے تھے جہاں اسے ریختہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امیر تیمور کے حملہ کے بعد مشرقی بادشاہوں کی وجہ سے جونپور اسلامی علوم کا ایک شاندار مرکز بن گیا تھا۔ اور اس کی یہ حیثیت عرصۂ دراز تک قایم رہی۔ اس لئے اسلامی علوم کی اشاعت اور ترویج سے پورب میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جو اُردو کی نشو و نما کے لئے بڑا سازگار تھا۔ چنانچہ بہار بھی اُن علاقوں میں شامل ہے جنھیں اُردو کی تربیت کے لحاظ سے اولیت کا

درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰۵۴ھ میں بیدل کی عظیم آباد پٹنہ میں پیدائش تک اُردو زبان نے بہار میں ارتقاء کے متعدد قابل قدر مراحل طے کر لئے تھے اور اسی لئے وہاں کے رہنے والے لوگوں کی زبانی بیدل نے اُردو کے اشعار بھی سنے۔ لیکن ان کی حیثیت صاف دو ہوں کی سی تھی۔

لیکن دہلی رہتے ہوئے انھوں نے جو شعر اُردو زبان میں کہے ہیں وہ زیادہ صاف ہیں :۔

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا — اپنے چہرہ سے جھجکتا ہے کہ کیوں خوب ہوا
مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہم ہیں — اُس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ان اشعار کے علاوہ مجھے اُردو میں بیدل کا اور کوئی شعر نہیں مل سکا اور تذکرۂ طور کلیم کا یہ بیان مجھے بالکل غلط نظر آتا ہے کہ جب ۱۱۳۳ھ میں ولی دکنی کا دیوان دہلی میں پہونچا تو دوسرے شعراء کے علاوہ میرزا عبدالقادر بیدل نے بھی ان کی تقلید کی، کیونکہ بیدل تپ محرقہ میں مبتلا رہنے کے بعد ۴ صفر ۱۱۳۳ھ کو فوت ہو گئے اور ولی کی تقلید کا موقع ہی انھیں نہیں ملا۔

البتہ جن خاص اصحاب اور ارباب فن کی وجہ سے اُردو زبان پر بیدل کا بالواسطہ اثر ہوا ہے ان کا یہاں مجملاً ذکر کر دینا ضروری ہے۔ شیخ سعداللہ گلشن، سراج الدین علی خاں آرزو، عمدۃ الملک نواب امیر خاں انجام، رائے انند رام مخلص، شاہ فصیح افصح، محمد امین منصب دار بادشاہی، یہ چھ بزرگ بیدل کے ان شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو زبان میں شعر کہے ہیں۔ شیخ سعداللہ گلشن کو تخلص بیدل نے عطا فرمایا تھا۔ ولی دکنی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں :۔

(شمس ولی دکنی) دلی میں آئے۔ یہاں شاہ سعداللہ گلشن کے مرید ہوئے شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو۔ مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً اُن کے اشارہ سے کی۔"

بیدل کے ایک اور مشہور شاگرد خان آرزو کے احسانات کا اعتراف آزاد ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

"خان آرزو کو زبان اُردو پر وہی دعویٰ پہونچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزو کے عیال کہلائیں گے۔"

بیدل کے اثرات کے سلسلہ میں انھوں نے شاہ حاتم کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاہ حاتم وہ بزرگ ہیں جن کے شاگردوں میں میرزا رفیع اور سعادت یار خاں رنگین بھی شامل ہیں۔ شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور بیدل ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ شاہ حاتم، امیر خاں انجام شاگرد بیدل کے مصاحب تھے اس لئے ان کے بیدل سے متاثر ہونے کے کافی امکانات نظر آتے ہیں۔

بیدل کے اثرات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اس سے بھی آگے اقبال و غالب تک پہونچتے ہیں۔ علامہ اقبال خود کہیں تو بیدل کو استاد کامل کہتے ہیں اور کہیں مفکر شاعر۔ انھوں نے ایک بار گوجرانوالہ کے ایک شاعر غلام حسین شاکر کو لکھا تھا کہ اپنے بیان میں حسن پیدا کرنے کے لئے بیدل کا مطالعہ کیجئے۔ اور غالب نے بھی متعدد جگہ بیدل کی شاعرانہ بلندی اور اس سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غالب ہی کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بیدل کا مزار بالکل نیست و نابود ہو چکا تھا :۔

گرے حضرت بیدل کا خط لوحِ مزار
اسد آئینۂ پرواز معانی مانگے

اس کے بعد خواجہ حسن نظامی مرحوم نے جب نواب درگاہ قلی خاں کی تصنیف "مرقع دہلی" کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا تو عُرس بیدل کا ذکر پڑھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مزار بیدل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ اپنے ۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء کے مراسلہ میں دفتر آل انڈیا چشتی پارٹی دہلی سے راقم سطور کو لکھتے ہیں :۔

"میں نے اس کتاب (مرقع دہلی) کا اُردو زبان میں ترجمہ شایع کیا تو اس پر نوٹ لکھا کہ معلوم نہیں میرزا بیدلؔ کا مزار کہاں ہے۔ یہ نوٹ پڑھ کر حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواریؒ نے مجھ کو لکھا کہ بیدلؔ کا مزار پرانا قلعہ دہلی کے سامنے حضرت ملک نورالدین یار پراں کے مزار کے قریب ہے۔ میں خود وہاں گیا۔ مزار بے نشان ہوچکا تھا۔ مگر جگہ مل گئی تب حضور نظام کو لکھا اور انھوں نے دو ہزار روپے بھیج کر مزار بنوا دیا اور کتبہ بھی لگوا دیا۔

اس موقع پر مزار پر جو کتبہ لگوایا گیا تھا اس کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"مرقد عبدالقادر بیدلؔ تاریخ وفات ۳ صفر ۱۱۳۳ھ"

اس کی ضروری تعمیر و ترمیم اعلیٰ حضرت پرنور آصف جاہ سابع دکن کی توجہات شاہانہ سے ۱۳۵۹ھ میں کرائی گئی۔

لیکن خوشگو، آزاد بلگرامی، حسین قلی خاں اور مصحفی کے بیانات کو پڑھ کر ہم فوراً کہہ اُٹھیں گے کہ مولانا حسن نظامی نے بیدلؔ کا مزار بالکل غلط جگہ پر بنوایا۔ مولانا مزار بیدلؔ پرانے قلعہ کے سامنے بتاتے ہیں، حالانکہ خوشگو کے بیان کے مطابق وہ شہر پناہ اور دہلی دروازہ سے باہر تھا یعنی پرانے قلعہ کی نسبت دہلی دروازہ زیادہ قریب تھا یہ دونوں ایک دوسرے سے تقریباً تین میل دور واقع ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔ کوئی چار سال گزرے، کابل میں دعویٰ کیا گیا کہ مزار بیدلؔ کابل میں ہے لیکن تحقیق سے یہ بات غلط نکلی اور یہ نتیجہ تھا محض حسن عقیدت کا۔ کابل میں بیدلؔ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ریڈیو پر بیدلؔ کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں محفلوں میں بیدلؔ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کتب خانوں میں زیادہ تر بیدلؔ کے نادر قلمی کلیات موجود ہیں۔

(اقتباس و اختصار از رسالہ اُردو کراچی)

ادارۂ فروغِ اُردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے پندرہ دن کے اندر آپ کے ذریعہ رجسٹری یا وی پی (وی پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپیہ سے کم کا نہ ہو اور محصول ڈاک بحساب ۱۵ فی صدی روانہ کیا جائے۔ نیجر نگار لکھنؤ

تاریخی و ادبی کتابیں

یدبیضا ... سید عابد علی کے دلنشین ڈراموں کا مجموعہ۔ ۵ر

سیاست الٰہیہ ... امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ ۸ر

ہماری داستانیں۔ ہماری قدیم داستانوں کی داستان ۵ر

نقوش لطیف ... مرتبہ احمد ندیم قاسمی ... ۳ر

مضامین جمال الدین افغانی ... ۵ر

انتقاد۔ سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۳ر

پانچ ناولٹ ... مرتبہ وقار عظیم۔ اس مجموعہ میں منٹو، شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور انتصار حسین کے بہترین ناولٹ ہیں ... ۳ر

تذکرۂ شعراء متغزلین ... شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ... ۱۰ر

امراؤ جان ادا ... للعہ

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا ... ۳ر — غزالہ ... ۲ر

خدانخواستہ ... ۳ر — سودیشی ریل ... ۳ر

کتیا ... ۳ر — سانچ کو آنچ ... ۳ر

کارٹون بے قاعدہ ۲ر — بار خاطر ... للعہ

بقراط ... ۲ر ... جوڑ توڑ ... للعہ

مضامین شوکت ... ۲ر

قاضی جی۔ ۳ حصے۔ فی حصہ ... ۳ر

غالب کے ڈرامے ... ۲ر

وغیرہ وغیرہ ... ۳ر

نقوش کے چند خصوصی نمبر

افسانہ نمبر۔ مجلد ... ۱۲ر ۱۰ر

شخصیات نمبر ... نمبر ۲ ... ۱۰ر

منٹو نمبر ... ۲ر

مکاتیب نمبر ... ۱۰ر

آزاد : ایک صحافی

پیغام — کلکتہ — ۱۹۲۱ء

عابد رضا بیدار :

مولانا آزاد کے صحافتی کارناموں میں بالواسطہ کلکتہ کے پیغام کا نام بھی آنا چاہئے۔ ذیل کی سطروں میں اسی کا تعارف کرایا گیا ہے۔

ابتدائی عمر کے چھوٹے چھوٹے تجربوں، اور 'الندوہ' اور 'وکیل' کی ادارت کے بعد ۱۹۱۲ء ـــــ ۱۹۱۶ء میں مولانا نے اپنا ہفتہ روزہ الہلال (اور البلاغ) نکالا جس نے ہندستانی صحافت میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۶ء کی پہلی ششماہی میں حکومتِ بنگال نے مولانا کو خطرناک ٹھہراتے ہوئے بنگال بدر کر دیا وہ رانچی آئے اور کچھ دن وہیں نظر بند کر دئے گئے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہائی ملی تو الہلال کے ساتھ الہلال کا زمانہ بھی حیرت انگیز تیزی سے بدل چکا تھا۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور دنیا کی سیاست نئے رُخ اختیار کر رہی تھی۔ ترکی، جرمنی کے ساتھی کی حیثیت سے شکست خوردہ ہو کر قسمت کے فیصلہ کا منتظر تھا کہ مصطفےٰ کمال 'مردِ از غیب' بن کر ترکی کو بچا لے گیا، اناطولیہ میں اس کی قیادت میں قومی حکومت قایم ہو گئی اور بالآخر ۱۹۲۳ء میں اتحادیوں کو کمال کی حکومت سے باعزت سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ لیکن اس اثنا میں مستقر خلافت کو خطرہ میں دیکھ کر ہندستانی مسلمانوں نے خلافت تحریک کی ابتدا کر ڈالی۔ آزاد اور محمد علی اس کے قایدِ اعلیٰ تھے۔ اُدھر ہندستانی آزادی کی تحریک گاندھی جی کی قیادت میں نئے دور کا آغاز کر چکی تھی۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات ہندستانیوں کی امیدوں سے کہیں کم نکلیں اور آزادی کی تحریک میں نسبتاً زیادہ جوش و خروش آگیا۔ خلافت کے مسئلہ کو گاندھی جی نے عام تحریک کا ایک بنا کر تحریک آزادی میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار اتنے بڑے پیمانہ پر ہندو مسلم تعاون و اشتراک کا سامان پیدا ہو گیا کہ اُس عہد کے بعض رہنمایانِ قوم کو تو اس حد تک اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا کہ وہ کہنے لگے کہ ہندوستان کی آزادی اب محض چند دن کی بات رہ گئی ہے۔ اور سچ مچ ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔

یہ فضا تھی جس میں آزاد کو رہائی ملی اور رہا ہوتے ہی خلافت تحریک، کانگریس، اور کانگریس کی چلائی ہوئی عدم تعاون کی تحریک کے زعماء میں ان کا شمار ہونے لگا۔

صحافت کو اپنے افکار کی نشر و اشاعت کا اہم ذریعہ وہ پہلے ہی سمجھتے تھے اور اس اخبار نویسی کے فن کو قوموں کی تقدیر بدلنے کا ایک اہم حربہ خیال کرتے تھے۔ الہلال کے زمانہ کی طرح اب انھیں یکسوئی اور فرصت تو تھی نہیں لیکن زمانہ متقاضی تھا کہ ایسے موقع پر جب خلافت تحریک اور وطنی تحریک اپنے نقطۂ عروج پر ہو، ایک اپنا ذاتی اخبار ضرور ہو۔ خود ترتیب دینے کے لئے وقت نہ تھا، بالآخر ایک حل نکل آیا، عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار کا "پیغام" کے نام سے اجرا ہوا، جس کی پالیسی کی نگرانی مولانا کے ذمہ رہی اور مولانا کو کچھ کہنا ہوتا تو اسی کے ذریعہ کہتے۔ پرچہ پر سرورق، زیر نگرانی مولانا ابوالکلام آزاد، چھپا ہوتا تھا۔ کچھ دن بعد اس فقرہ کی جگہ اس عبارت نے لے لی :- "اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین شایع ہوتے ہیں"۔ تذکرہ کے مرتب فضل الدین احمد مرزا، پیغام کے پبلشر

اور پرنٹر تھے جو مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری بھی تھے۔ "پیغام" الہلال کے آدھے سائز اور بھدے کاغذ پر لیتھو میں چھپتا تھا۔ دو آنے قیمت تھی اور چھ روپے سالانہ۔ اس کے چند ہی نمبر نکلے جن کی تفصیل درج ذیل ہے، ہاں ایک بات اور:۔ پیغام میں چھپنے والی مولانا کی تحریروں کا بیشتر حصہ قول فیصل اور تازہ مضامین میں آچکا ہے۔

پہلی جلد، شمارہ: ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء: ۱۶ ص۔

ابوالکلام آزاد:۔ افتتاحیہ: پیغام کے اجراء کی تقریب
علی برادر کی گرفتاری
سودیشی کی فتح
مالیبار کی بدامنی
مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب: خلافت کمیٹیوں کو اب کیا کرنا چاہئے: ایک سال چھ ماہ

ادارہ:۔ حضرت امیر شریعت صوبۂ بہار کا فرمان ۔ از محمد بدرالدین۔

مقالات: انقلاب فرانس، ایک اجمالی تاریخی نظر نمبر۱، مسئلہ شام از رشید رضا

عالم اسلامی: اناطولیہ (تعارف)

پہلا صفحہ مکمل: باب فتح و مقصود کا افتتاح: محمد علی، شوکت علی کے سفر حج کا اختتام اور گرفتاریوں کی ابتداء

نمبر۲، ۳، ۴: ۳۰ ستمبر، ۷ اکتوبر، ۱۴ اکتوبر: ۲۴ ص

[عزم و عمل کی دعوت: قانون شکنی کی طرف پہلا قدم: مجلس جمعیۃ العلماء کا فیصلہ: ضبط شدہ فتویٰ چھاپا جائے اور اشاعت جاری رہے: جمہوریت ہند کے قیام کی تیاریاں ——— (پہلا صفحہ)]

[ان الحکم الا للہ
انقلاب فرانس، شخصی آزادی، نمبر۲
جنگ اناطولیہ کی خبریں: عربی اخبارات سے
رہنمایانِ ملک کی گرفتاری (اداریہ)
مسئلہ عرب و شام ۔ ۲

عالم اسلام: مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی تصریحات (الاخبار، مصر سے)
شام آزادی چاہتا ہے: جنیوا میں شامیوں کی کانفرنس،
ٹرکی میں برطانیہ کے ارادے: سلطان المعظم کی مخالفت
اناطولیہ کی قومی حکومت: سفیر پولینڈ کی نظریں

مختارات: مشرق میں الزاس و لورین: مارننگ پوسٹ کیا کہتا ہے
یہودی بیت المقدس میں حکومت نہیں کر سکتے: ایک با اثر امریکن یہودی کے خیالات
ہندوستان پہلے خوشحال تھا یا اب ہے؟ ——— امریکہ کے حبشیوں کی حیرت انگیز ترقی۔
حضرت امیر شریعت صوبۂ بہار کا اعلان (اناطولیہ کی قومی حکومت کی حمایت میں)
مولانا محمد علی کا پیغام اہل ہند کے نام ——— اسیرانِ ملت کا مشترک پیغام
مجلسِ جمعیۃ العلمائے ہند کا فیصلہ: ضبط شدہ فتویٰ چھپتا رہے۔

پچاس لیڈروں کا اعلان : سرکاری ملازمت قومی خودداری کے منافی ہے ۔
مہاتما گاندھی کی اپیل، مسلمانان ہند کے نام
کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویزیں :۔
شہزادے ویلز کی آمد پر ہڑتال ہو ۔
ہمسایہ ملکوں سے ہندوستان کے تعلقات
انگریزی گورنمنٹ ہندوستان کی نمایندہ نہیں ہے
ورکنگ کمیٹی کی دوسری نشست :۔
علی برادر کو مبارکباد: کراچی رزولیوشن اور سول ڈس اوبی ڈینس کی تائید]

——— اس شمارہ میں مولانا کی کوئی تحریر نہیں تھی، اڈیٹر نے ادارتی نوٹ میں اس کی معذرت بھی کی تھی ۔

شمارہ ۵ : ۲۱ر اکتوبر : ۱۶ ص
فیصلہ کا انتظار (حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہٗ کے قلم سے)
حضرت مولانا ابوالکلام مدظلہٗ کا برقی پیغام : انگورہ کی مالی اعانت ، بدیشی کپڑے کا مقاطعہ ۔
[۔ "آزادی قریب ہے ، ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو یاد رکھو"
ایک صفحہ پر کونے میں موٹا موٹا بس اتنا لکھا تھا ۔
— پہلے صفحہ پر "قتل مسلم" والی قرآنی آیت]

شمارہ ۶ : ۲۸ر اکتوبر :
کیا آخری منزل آگئی (آزاد)
[پہلا صفحہ ——— انگورہ فنڈ ، اناطولیہ کی خبریں
شذرات : ہندستانی جدوجہد کے متعلق برمنی میں کیا کہا جاتا ہے ؟ ۔ سعید بن جبیر کا مقدمہ (مکالمہ)
حقیقی جمہوریت (ایک امریکن رسالے سے)]

شمارہ ۷ : ۴ر نومبر
کیا آخری منزل آگئی ۔۲ (آزاد)
کراچی رزولیوشن (آزاد)
[پہلا صفحہ ——— پرنس آف ویلز کی آمد : ۱۷ر نومبر امتحان کا دن ہے ۔۔۔۔۔۔
آزادی کی قدر و قیمت ——— از عبدالرحمٰن نگرامی]

شمارہ ۸ : ۱۱ر نومبر
مواعظ و خطب : ماہ ربیع الاول اور تذکارِ ولادت نبویؐ (آزاد)
[مصر کے جلاوطن لیڈر علی فہمی کامل کا پیغام اہلِ وطن کو ۔
اودھ کے کاشتکار و زمیندار ہوشیار ہو جائیں : گورنمنٹ دھوکا کر رہی ہے ۔
تاریخ استقلالِ ترکیہ
ایک گوشے میں :۔ "اگر قانون شکنی کی تمنا ہو تو کھدر پہن لو اور چرخہ چلانا سیکھ لو ۔]

۹ ۱۸ر نومبر — [کیا ہندوستان سول ڈس اوبی ڈی نیس کے لئے طیار ہے ——— پہلا صفحہ
فضل الدین احمد مرزا کا ایک ترجمہ
آزادی از عبدالرحمٰن، نگرامی]

۱۰ ۲۵ر نومبر — خطبۂ صدارت حضرت مولانا ——— جمعیتہ العلماء، اجلاس لاہور
[سوراج یا موت، آزادی کی تحریک اور حکومت کا طرز عمل (نگرامی)
ضمیمۂ پیغام (ٹائپ میں)]

۱۱ ۲ر دسمبر — اڈیٹر پیغام کی گرفتاری (آزاد)
خطبۂ صدارت ——— ۲ (آزاد)
شورش بمبئی کی نسبت ابوالکلام آزاد کا یہ بیان بمبئی کے اخبارات میں نکلا ہے :— .....
[انگورہ ——— سول نافرمانی پر قرآن حکیم سے ایک نظر (نگرامی)] (آزاد)

۱۲ ۹ر دسمبر — آخری منزل کے آثار پھر شروع ہو گئے (آزاد)
خطبۂ صدارت ——— ۳ (آزاد)
[آزادی کے رہنما اور ان کے فرائض (نگرامی)]
——— پرچہ کا کچھ حصہ ٹائپ میں ہے۔

۱۳، آخری شمارہ ۱۶ر دسمبر: یہ تحریر حضرت مولانا کی گرفتاری کے بعد ان کے کاغذات میں سے دستیاب ہوئی ہے:۔ "پیغام" (آزاد)
خطبۂ صدارت ——— تکمیل نمبر ۴ (آزاد)
[رفتار سیاست ، افکار و حوادث : حضرت مولانا کی گرفتاری
اڈیٹر پیغام کو دو سال کی قید سخت
اعتذار : روزانہ پیغام صرف مقامی لوگوں کے لئے جاری کیا جاتا ہے۔
مختارات : مشرق کی بیداری (المنار سے)]
——— یہ پورا پرچہ ٹائپ میں تھا

—— اور یہ ہے "پیغام" کا افتتاحیہ، جس کے اہم اقتباسات پیش کرنے سے صحافت میں مولانا کی نئی مشغولیت کی نوعیت کا اندازہ ہو جائیگا

"ہذا بلاغ للناس، ولینذروا بہ، ولیعلموا انما ہو الٰہ واحد، ولیذکر اولوالالباب" (۱۴ : ۲۵)

معاشراں گرہ از زلف یار باز کنید — شبے خوش ست، بہ این قصہ اش دراز کنید

الحمد للہ وعدہٗ ۔ ار جنوری ۲۰ء کو جب مجھے چار سال کے بعد نظر بندی سے رہا کیا گیا تو میں آیندہ زندگی، زندگی کے کاموں اور کاموں کے طریق و اسلوب کی نسبت خالی الذہن نہ تھا، اور نہ اپنے ارادے کے بہنے کے لئے واقعات و حوادث کے کسی سیلاب کا منتظر تھا۔ میں نے ہمیشہ بہنے کی جگہ چلنے کی کوشش کی ہے اور اس وقت بھی اپنے سفر عمل کے لئے ایک طے شدہ راہ اختیار کر چکا تھا ..... میں نے آیندہ کے لئے جن امور کا ارادہ کیا تھا، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں رفقاء و طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھ رہوں گا، اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مشغول ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیش نظر تھے، ان کے لئے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی، قیام و استقرار ہی مطلوب تھا .....

لیکن عزت ربی لفسخ العزائم - بالآخر مجھے سیلاب میں بہنا ہی پڑا..... جنوری ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک زمانہ ..... تامتر پے درپے دوروں اور عام تحریک کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہوگیا اور تمام دوسرے مشغلے یکقلم ملتوی کردینے پڑے۔ نہ تصنیف و تالیف کی تکمیل ہوسکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کرسکا، نہ البلاغ جاری کیا جاسکا، نہ اپنے پیشِ نظر مہمات کار دلجمعی کے ساتھ انجام پاسکے.....

اس حالت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود موجودہ تحریک کے قیام و استواری کے لئے جس دعوت و تبلیغ اور ہدایت و تعلیم کی ضرورت تھی اس کا کوئی باقاعدہ اور صحیح انتظام نہ ہوسکا۔ فی الحقیقت الہلال اور البلاغ کی ضرورت جس قدر اُس وقت تھی جبکہ تخم ریزی کا موسم تھا، اس سے کہیں زیادہ اب ہے جبکہ آبیاری اور نگہبانی کا وقت آگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ابتدا سے تحریر و اشاعت کا کوئی ایسا سلسلہ جاری رہتا جو ہمیشہ تحریک خلافت کے لئے مشورہ و ہدایت بہم پہونچاتا، اور ہر طرح کی غلطیوں اور لغزشوں سے کارکنوں کو متنبہ کرتا رہتا۔ نیز مخالفین و مشککین و ضعفاء قلوب کے شکوک و شبہات کا بھی ہر وقت ازالہ ہوتا رہتا۔ گزشتہ سال ایسی ضرورت کی بنا پر مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے شعبۂ تبلیغ و اشاعت قایم کیا گیا اور رسالہ 'خلافت و جزیرۃ العرب' کی تصنیف و اشاعت عمل میں آئی، ارادہ تھا کہ اشاعت کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا، لیکن پھر وہی موانع سدِ راہ ہوگئے جو میری تمام مشغولیتوں کے لئے ہوچکے ہیں۔

پس اگر بحالت موجودہ اس ضرورت کا کوئی علاج میرے اختیار میں تھا تو وہ یہی تھا کہ دیگر اہلِ قلم کے زیر اہتمام ایک رسالہ جاری ہوجاتا، مسلک و مشرب کی نگرانی میرے ذمے رہتی، اور جس قدر بھی فرصت ہاتھ آتی وقت کے ضروری مسایل و مقامات پر میری تحریرات وقتاً فوقتاً اس میں شایع ہوتی رہتیں۔

چنانچہ اس غرض سے "پیغام" جاری کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ جن احباب نے اس کی ترتیب و اہتمام کا بار اُٹھایا ہے، ان کی مستعدی وقت کی ایک سب سے بڑی ضرورت کے لئے مقبول و مشکور ہوگی۔

۱۔ اس رسالہ کی اشاعت سے بالفعل صرف یہ مقصود ہے کہ موجودہ تحریک کے لئے تبلیغ و ہدایت کا ایک باقاعدہ سلسلہ قایم ہوجائے پس اصل موضوع رسالہ کا یہی ہے۔ البتہ گاہ گاہ علمی و مذہبی مضامین کے لئے بھی گنجایش نکالی جائے گی۔ تفسیر قرآن کے بعض مناسبِ وقت مباحث اور حصے بھی شایع ہوتے رہیں گے۔

۲۔ احباب کرام کو چاہیئے کہ حالت سے زیادہ توقع نہ رکھیں اور سردست ان امیدوں کے ساتھ پیغام کو نہ دیکھیں جو الہلال و البلاغ کیلئے مخصوص تھیں۔ جس وقت تک موجودہ حالت جاری ہے، میں صرف اتنا کرسکتا ہوں کہ ہر نمبر کے لئے بقدر فرصت کچھ نہ کچھ مواد مہیا کرتا رہوں وقت کے ضروری معاملات و سوالات کی نسبت میری تحریریں بالالتزام اس میں نکلتی رہیں گی۔ لیکن پرچے کی ترتیب اور بقیہ حصے کے مضامین خود اڈیٹر اور دیگر اہلِ قلم کے متعلق رہیں گے۔

۳۔ بالفعل رسالے میں مقالات اور مختارات کے علاوہ استفتاء اور استفسارات کے ابواب بھی بالالتزام رہیں گے اور ان کے نیچے تمام ضروری سوالات کے جوابات درج ہوتے رہیں گے جو اس وقت خطوط کے ذریعہ صرف مستفسرین تک ہی محدود رہتے ہیں۔

۴۔ ہر تحریر کا ایک موضوع اور مقصد ہوتا ہے اور اس کا اسلوب اور اندازِ بیان اسی کے مطابق اختیار کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد صرف تبلیغ ہے، انشاء و ادب نہیں ہے۔ پس جس قدر مضامین نکلیں گے، نہایت صاف، سہل اور آسان زبان میں ہوں گے، اس کے اوراق سے الہلال کے لٹریچر کی توقع صحیح نہ ہوگی۔

۵۔ یہ پہلا نمبر اس لئے شایع کردیا جاتا ہے کہ سلسلہ شروع ہوجائے۔ انشاء اللہ آیندہ نمبروں سے تمام مضامین کی تقسیم و تبویب شروع ہوجائے گی۔

ابوالکلام احمد"۔

باب الاستفسار

اثر لکھنوی کے دو شعر

(پروفیسر ارشد کاکوی - ڈھاکہ)

مکرمی و محترمی نیاز صاحب ، تسلیم و نیاز

دو تین دن ہوئے یہاں ایک صحبت میں مَیں نے ڈاکٹر عندلیب شادانی کو مجری اثر صاحب کے دو شعر سنائے اور بہت ڈرتے ڈرتے دبی زبان میں اپنے اس شبہ کا اظہار کیا کہ یہ شعر ناموزوں معلوم ہوتے ہیں ۔ اثر صاحب قبلہ کے شعر اور ناموزوں ؟ ۔ چنانچہ میں نے بہت سہمے ہوئے انداز میں اپنے شبہ کو ظاہر کیا۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

دید کی عشرت، محویت، پھر بدہوشی میخوار کی سی، شوق نے ختم یہیں پہ کیا پُر لطف ملاقاتوں کو
غم میں وہ لذت پائی ہم نے ذوق طلب پہ نثار کیا حُسن قبول عطا جو ہوا بھی شب کی مناجاتوں کو

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے چھوٹتے ہی فرمایا کہ یہ شعر ناموزوں ہیں اور کسی طرح غریب کاتب کو بھی مورد الزام ٹھہرانے کی گنجائش نہیں لیکن ڈاکٹر شادانی نے بڑی سنجیدگی سے مجھے سمجھایا کہ یہ شعر ناموزوں نہیں ہیں ۔ بالکل صحیح ہیں ۔ ہاں جناب کاتب سے سہو ہوا ہے اور انھوں نے پہلے شعر میں "لا" اور دوسرے شعر میں "نا" چھوڑ دیا ہے ۔ لکھنؤ میں مناجات کو مناناجات اور ملاقات کو ملالاقات بولتے ہیں ۔ اب جو میں نے ان اشعار کو اُن کے مشورے کے آئینہ میں پڑھا تو واقعی اشعار موزوں تھے ۔

ازراہِ کرم "نگار" میں اس پر روشنی ڈالئے

والسلام

(نگار) ان مصرعوں کے بابت ڈاکٹر سبزواری نے جو رائے ظاہر کی ہے، وہی ڈاکٹر شادانی کی بھی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ ایک نے صاف صاف کہدیا کہ یہ ناموزوں ہیں اور دوسرے نے مزاحیہ انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے ضمناً یہ بھی بتا دیا کہ ان مصرعوں میں ایک سبب خفیف کی کمی ہے ۔ زیادہ مناسب ہوتا اگر پہلے وہ غزل کی بحر متعین کرتے اور پھر تقطیع کرکے بتاتے کہ بحر متعینہ کے لحاظ سے ان مصرعوں میں کیا نقص ہے ۔ انھوں نے غالباً اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور سرسری طور پر اپنی رائے ظاہر کردی ۔

اس بحث میں سب سے پہلے سوال تعیینِ بحر کا آتا ہے ۔ یعنی یہ کہ اثر صاحب کی وہ غزل جس کے یہ دو مصرعے زیرِ بحث ہیں کس بحر میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مزید وضاحت کے لئے پہلے پوری غزل نقل کردینا مناسب ہے :-

۱- کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو
۲- صبح کو جلوہ بر سرِ منبر شب کو پیرے خانہ، اب کہئے تو بھلا کیا کہئے ایسی مقدس ذاتوں کو
۳- وہ جو نہ آئے بادل چھائے گرجے برسے کھل بھی گئے اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانے برساتوں کو
۴- بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خونِ دل عاشق ہو جائے کام نہیں کچھ خونریزی سے تیرے حنائی ہاتھوں کو

۵ - شرم و حیا ہے ناز و ادا ہے، عشوہ کرشمہ شوخی بھی — کیا تمھیں لینے جانا کہیں ہے دل لینے کی گھاتوں کو
۶ - کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے کیسی کیسی مہر و وفا — تلخ اگر سن سکتے نہیں تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو
۷ - دید کی حسرت محویت پھر مدہوشی مے خوار کی سی — شوق نے ختم یہیں پہ کیا پُر لطف ملاقاتوں کو
۸ - غم میں وہ لذت پائی ہم نے ذوق طلب پہ نثار کیا — حسن قبول عطا جو ہوا بھی شب کی مناجاتوں کو
۹ - ہوش ہو سب ہے اپنی بیتی لاکھ کرو انکار اثر — نیند آنکھوں کی اُڑاتے ہو کہہ کے فسانہ راتوں کو

اس غزل کو پڑھتے ہی دو بحریں ہمارے سامنے آتی ہیں :- بحر متدارک اور بحر متقارب کیونکہ یہ دونوں بحریں صورت و ایقاع (RHYTHM) کے لحاظ سے اس قدر مماثل ہیں کہ بظاہر ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن عروضی نقطۂ سے ان میں کافی فرق ہے۔

مثالاً دو مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱- صحرا صحرا، گلشن گلشن، ہر جا اس کا جلوہ ہے

۲- پتہ، پتہ، بوٹا، بوٹا، حال، ہمارا، جانے ہے

یوں پڑھنے میں دونوں مصرعے یکساں ایک ہی بحر کے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ مصرع اول بحر متدارک مثمن کا ہے اور دوسرا بحر متقارب مثمن کا۔ کیونکہ پہلے مصرع کا وزن فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعِلُنْ، فَعْ۔ ہے اور دوسرے مصرع کا وزن ہے فَعَلُنْ، فَعَلُنْ، فَعَلُنْ، فَعَلُنْ، فَعُولُن، فَعَلُنْ، فَعْ۔ یہ فرق اس لئے پیدا ہوگیا کہ مصرع اول کے تمام ارکان فَعِلُنْ کے وزن پر ہیں اور مصرع ثانی کا پانچواں رکن بروزن فَعَلْ ہے اور چھٹا رکن بروزن فَعُولُن۔

اہل عروض نے ہر بحر کے زحافات[1] متعین کر دئے ہیں اور اثر صاحب کی غزل میں تمام زحافات بحر متقارب ہی کے استعمال ہوئے ہیں۔ زیادہ وضاحت کی غرض سے پوری غزل کی تقطیع کر دینا مناسب ہوگا :-

۱- کھوئے ہوئے سے (فَعُلْ، فَعُولُنْ)۔ رہنا دن کو (فَعَلُنْ، فَعُلُنْ)۔ روتے پھرنا (فَعَلُنْ، فَعَلُنْ)۔ راتوں (فَعُلُنْ)۔ کو (فَعْ)۔
جو ہیں عاقل (فَعَلُنْ، فَعَلُنْ)۔ وہ کیا سمجھیں (فَعُلُنْ، فَعلُنْ)۔ عشق و جنوں کی (فَعُلْ، فَعولن)۔ باتوں (فَعَلُنْ)۔ کو (فَعْ)۔
پورا شعر بحر متقارب مثمن اثرم اثلم ابتر کا ہے

۲- صبح کو جلوہ (فَعُلْ، فَعُولُنْ)۔ ہر سر منبر (فَعَلْ، فَعُولُنْ)۔ شب کو پیرے (فَعلن، فَعلُنْ)۔ میخا (فَعلُنْ)۔ نہ (فَعْ)۔
اب کہئے تو (فَعلَنْ، فَعْلُ)۔ بھلا کیا (فَعُولُنْ)۔ کہئے (فَعلَنْ)۔ ایسی مقدس (فَعلُ، فَعُولن)۔ ذاتوں (فعلن)۔ کو (فع)۔
پورا شعر بحر متقارب مثمن اثلم اثرم ابتر کا ہے

۳- وہ جو نہ آئے (فَعْلُ، فَعُولن)۔ بادل چھائے (فَعَلُن، فعلنْ)۔ گرجے برسے (فَعلُن، فَعلُنْ)۔ کھل بھی گئے (فَعلُ، فَعَلْ)
اس کے سوا ہم (فَعْلُ فَعُولُنْ)۔ ہجر کے مارے (فَعْلُ فَعُولن)۔ کیا جانیں ہر (فَعلُن فَعلُن)۔ ساتوں (فعلن)۔ کو (فع)
مصرع اول :- بحر متقارب مثمن اثلم اثرم محذوف
مصرع دوم :- بحر متقارب مثمن اثلم اثرم ابتر

---

[1] بحر متقارب کا رکن سالم فعولن ہے اور اس کے زحافات یہ ہیں :-
فعولان (تسبیغ)۔ فَعُولُ (قبض)۔ فَعُولُنْ (ثلم)۔ فاع۔ فَعْلُ (شرم)۔ فَع (بتر)۔ فَعَلْ (حذف)

۴۔ بات (فَعَلُ) ۔ یہ اور (فَعُوْلُ) ۔ رہ شوق (فَعول)۔ کِ ہاتھوں (فعولن)۔ خون (فَعَلُ)۔ دے عا (فعولن) شوق ہو (فَعَلن)۔ جائے (فَعَلُ) کام نہیں کچھ (فَعَلُ، فَعُولُن)۔ خونرے (فعَلُن)۔ زی سے (فَعَلُن)۔ تیرے حنائی (فَعَل، فَعولن)۔ ہاتھوں (فَعَلُن) ۔ کو (فع)

مصرعِ اول : بحر متقارب مثمن اثرم اثلم مقصور

مصرعِ دوم : بحر متقارب مثمن اثرم اثلم ابتر

۵۔ شرم و حیا ہے (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ تازہ ادا ہے (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ عشوہ کرشمہ (فعلُ فَعُولُنَ) ۔ شوخی (فعلن) ۔ بھی (فَع) کیا تمھیں لینے (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ جانا کہیں ہے (فَعَلُ، فَعُولُنَ)۔ دل لے (فَعَلُنَ) ۔ نے کی (فَعَلُنَ)۔ گھاتوں (فعلن) ۔ کو (فع)

پورا شعر بحر متقارب مثمن اثرم اثلم ابتر کا ہے

۶۔ کیا کیا ہم پر (فَعَلُن، فَعَلن) ۔ لطف و کرم ہے (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ کیسی کیسی (فَعَلُن، فَعلن) ۔ ہو و وفا (فَعَلُ، فَعَلُ) تلخ اگر سن (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ سکتے نہیں تو (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ کیوں چھیڑو ان (فَعَلُنَ، فَعلنَ) ۔ باتوں (فَعلن) ۔ کو (فع)

مصرعِ اول : متقارب مثمن اثرم اثلم محذوف

مصرعِ دوم : متقارب مثمن اثرم اثلم ابتر

۷۔ دیدِ کِ عشرت (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ محویت پھر (فَعَلن، فَعَلنَ) ۔ مدہوشی سے (فَعَلُن، فَعلن) ۔ خار (فَعَلُ) ۔ کِ سی (فَعَلُ) شوق نِ ختم (فَعَلُ، فَعُولُ) ۔ یہی پ (فَعُولُ) ۔ کیا پر (فَعُولُنَ) ۔ لطف (فَعَلُ) ۔ ملا قا (فعولن) ۔ تو ں کو (فَعَلن)

مصرعِ اول : متقارب مثمن اثرم اثلم محذوف

مصرعِ دوم : متقارب اثرم اثلم مقصور،

لیکن صرف سات ارکان کا

۸۔ غم ہم و لذت (فَعَلُ، فَعُولُن) ۔ پائی ہم نے (فَعَلن، فَعَلنَ) ۔ ذوق (فَعَلُ) ۔ طلب پ (فَعُولُ) ۔ نثار (فَعُولُ) ۔ کیا (فَعَلُ) حُسنِ قبول (فَعَلُ، فَعُولُ) ۔ عطا ج (فعول) ۔ ہوا بھی (فَعُولُن) ۔ شب کِ (فَعَلُ) ۔ مناجا (فَعُولن) ۔ توں کو (فعلن)

مصرعِ اول : متقارب مثمن اثلم اثرم مقبوض مقصور

مصرعِ دوم : متقارب اثلم اثرم مقصور

لیکن صرف سات ارکان کا

۹۔ ہونہ ہو سب ہے (فَعَلُ، فَعُولُنَ) ۔ اپنی بیتی (فَعَلن، فَعَلن) ۔ لاکھ کروان (فَعَلُ، فَعُولُن) ۔ کار (فَعَلُ) ۔ اثر (فَعَلُ) نیند آ (فَعلن) ۔ کھوں کی (فَعَلن) ۔ اڑاتے (فَعُولن) ۔ ہو کہ (فَعَلن) ۔ کہ کِ (فَعَلُ) ۔ فسانہ (فَعُولن) ۔ راتوں (فَعَلن) کو (فع)

متقارب مثمن اثرم اثلم محذوف

متقارب مثمن اثلم اثرم ابتر

اب آپ پوری غزل کی تقطیع کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ دو مصرعوں کے سوا ساری غزل بحر متقارب مثمن میں ہے، یعنی اس کے جملہ ارکان (زحافی و غیر زحافی) آٹھ ہیں، لیکن ان دو مصرعوں کے ارکان جن پر اعتراض کیا جاتا ہے آٹھ کی جگہ سات ہیں اور آٹھواں رکن فع (زحاف ابتر) غائب ہے۔ اور اسی لئے وہ ناموزوں ہیں۔

یہاں تک تو آپ کے استفسار کا جواب ہوگیا، لیکن اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ بات سُن لیجئے۔ وہ یہ کہ میں نے خود

جناب اثر سے دریافت کیا کہ وہ ان مصرعوں کے بابت کیا فرماتے ہیں تو انھوں نے جواباً تحریر فرمایا کہ یہ دونوں مصرعے غلط چھپ گئے ہیں۔ صحیح مصرعے یوں ہیں :-

۱- شوق نے ختم یہیں پہ کیا ایسی پُر لطف ملاقاتوں کو
۲- حُسنِ قبول عطا جو ہوا بھی آخرِ شب کی مناجاتوں کو

اثر صاحب کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اُن مصرعوں کو ناموزوں سمجھتے تھے اور اسی لئے اب انھوں نے پہلے مصرع میں ایسی کا اضافہ کیا اور دوسرے مصرع میں لفظ آخر کا، یعنی اثر صاحب کو مصرع نمبر ۱ میں دو سبب خفیف کی کمی محسوس ہوئی (حالانکہ اس میں صرف ایک سبب خفیف کم تھا) اور دوسرے مصرع میں ایک سبب خفیف اور ایک سبب ثقیل کی۔ حالانکہ اس میں بھی صرف ایک سبب خفیف کی کمی تھی۔ اب رہا یہ امر کہ اس تصحیح کے بعد مصرع موزوں ہو گئے یا بدستور ناموزوں ہیں، اس کا فیصلہ زیادہ دشوار نہیں۔

مکتبۂ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری و معنوی حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمائیے اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں اُن کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ منی آرڈر ہمارے پاس بھیجدیجئے (کمیشن وی، پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہونا چاہئے، جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بحساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا چاہئے۔ منیجر نگار لکھنؤ

سلسلہ تاریخ و سوانح

حیات محمدؐ ---- (محمد حسین ہیکل) ---- اُنیس روپیہ
ابوبکر صدیق ---- (" ") ---- دس روپیہ
الحسین ---- (" ") ---- ڈھائی روپیہ
الزہرا ---- (" ") ---- دو روپیہ
الہارون ---- (" ") ---- پانچ روپیہ
خالد سیف اللہ ---- (ابوزید شبلی) ---- پانچ روپیہ
عمرو بن العاص ---- (حسن ابراہیم حسن) ---- پانچ روپیہ
چنگیز خاں ---- (ہیرلڈ لیمپ) ---- پانچ روپیہ
امیر تیمور ---- (" ") ---- سات روپیہ

سلسلہ نفسیات عملی

جینے کا قرینہ ---- (آندرے مورو) ---- چھ روپیہ
پریشان ہونا چھوڑئے۔ (ڈیلی کارنیگی) ---- چھ روپیہ
میٹھے بول میں جادو ہے۔ (" ") ---- سات روپیہ
جینے کی اہمیت ---- (لین یونانگ) ---- بارہ روپیہ

زندگی کا راستہ ---- (یوس ہٹیں چیسیر) ---- چھ روپیہ
کامیابی کا راستہ ---- (" ") ---- چار روپیہ
اپنا راستہ خود بناؤ ---- (خالق کامراں) ---- چار روپیہ
کیا آپ کاروبار کرتے ہیں۔ (اعجاز حسین) ---- پانچ روپیہ

علم و تنقید

ولی سے اقبال تک ---- (سید عبداللہ) ---- پانچ روپیہ
انسان اور آدمی ---- (محمد حسن عسکری) ---- چار روپیہ
مقدمہ شعر و شاعری ---- (ڈاکٹر وحید قریشی) ---- دس روپیہ
تذکرۂ شوق ---- (عطاء اللہ پالوی) ---- چھ روپیہ
میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء۔ (محمود فاروقی) ---- پانچ روپیہ

منٹو کے افسانے

پھندنے ---- (سعادت حسین منٹو) ---- پانچ روپیہ
گنجے فرشتے ---- (" ") ---- پانچ روپیہ
ٹھنڈا گوشت ---- (" ") ---- تین روپیہ
چغد ---- (" ") ---- تین روپیہ

باب المراسلہ والمناظرہ

کیا اقبال کا یہ شعر مہمل ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اڈیٹر چٹان کے استفسار پر اصحاب علم و نظر کے خطوط[1])

پروفیسر رشید احمد صدیقی

شورش صاحب مکرم ، السلام مسنون -

عنایت نامہ مورخہ ۳۱ جنوری - میرے نزدیک اقبال اس اعتبار سے اُردو کے بیشتر دوسرے شاعروں سے ممتاز اور منفرد ہیں کہ انھوں نے نہ تو مہمل شعر کہے ہیں نہ محض شاعرانہ اُپج دکھائی ہے - وہ شعر کو ہر پہلو سے مکمل کر لیتے تھے ، اس کے بعد سپرد قلم کرتے تھے - میرے نزدیک زیر بحث شعر بہت اچھا اور صاف ہے - احتیاطاً میں نے اپنے دو ایسے دوستوں سے بھی استصواب رائے کر لیا ہے - جو فارسی اُردو شاعری کے اسرار و غوامض پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں - ان کی تشریحات درج ذیل ہیں :-

پروفیسر ضیاء احمد

"میرے خیال میں علامہ اقبال کا یہ شعر بہت پر معنی ہے اور معنی ظاہر ہیں یعنی نرگس بظاہر آنکھ رکھتی ہے مگر بصارت سے محروم - اور اسی کے ساتھ (نرگس) اپنی بے بصارتی پر ماتم کناں بھی ہے - جس سے صاف روشن ہے کہ اس چمن (دنیا) میں اہل بینش مشکل سے پیدا ہوتے ہیں - مصرع ثانی دعویٰ ہے اور مصرع اول دلیل"۔

پروفیسر محمد عزیز

"شعر کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے :- دیدہ وری کے لئے صرف آنکھیں کافی نہیں ، بلکہ آنکھوں میں نور بصارت کا ہونا بھی ضروری ہے - ورنہ آنکھیں تو نرگس کے بھی ہیں ، جو نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس کے لئے گریہ و زاری بھی اسی طرح بے سود ہے اور جس کا حاصل ہونا بہت دشوار ہے ، اسی لئے کہا ہے کہ ایسا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے"۔

بعض احباب شعر کے مصرعوں کو دو لخت سمجھتے ہیں مگر ایسا ہے نہیں ، ان میں ربط ہے - مثلاً ہزاروں سال نرگس .. تب کہیں جا کر کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ نرگس کا ایک پھول دیدہ ور پیدا ہو گیا ! بہر حال شعر یقیناً با معنی ہے - " اور بات ہے کہ میں ایسا ثابت نہ کر سکا ہوں ——— (آپ یقیناً ثابت نہیں کر سکے - نیاز)

علامہ نیاز فتحپوری

گرامی عزیز - اقبال کے شعر ("ہزاروں سال ——") کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ وہ مہمل ہے اور کسی کا محض شاعرانہ اُپج ظاہر کرنا دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں - کیونکہ شاعرانہ اُپج بھی بغیر کسی دلیل و ثبوت کے مہمل ہی سمجھی جاتی ہے -

---

[1] میں نے ان خطوط کا صرف ملخص پیش کیا ہے - (نیاز)

نرگس اگر بے نور ہے تو وہ ہمیشہ بے نور ہی رہے گی خواہ وہ کتنا ہی روئے اور اُسے بغیر کسی تاویل کے (جو اس شعر میں مفقود ہے) دیدہ ور کہہ دینا پادر ہوا بات ہے۔

اقبال دونوں مصرعوں میں ربط پیدا نہیں کر سکے، اگر پہلے مصرع کا انداز بیان کچھ اس قسم کا ہوتا کہ ؎

بڑی دشواریوں سے چشم نرگس وا ہوئی ہوگی

تو ربط پیدا ہو جاتا ـــــ مارچ کے "نگار" میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کروں گا۔

مارچ کے "نگار" سے

ہر شاعر کے کلام میں بعض مصرعے ایسے ہوتے ہیں، کہ ان کو دیکھ کر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ ذہن شاعر میں دفعتاً القاء ہوئے ہونگے اور نظم یا غزل لکھنے کی تحریک انھیں سے پیدا ہوئی ہوگی۔

اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع : ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسی نوع کا الہامی مصرع ہے جو بغیر کسی کاوش کے ذہن شاعر میں آیا ہوگا اور اس کے بعد مصرع اول کی جستجو ہوئی ہوگی۔ اسلئے ضروری ہے کہ پہلے دوسرے مصرع کے الفاظ و مفہوم کو سامنے رکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس مصرع میں دو لفظ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ چمن اور دیدہ ور، اس لئے جب مصرع اول کی کاوش انھوں نے کی ہوگی، تو مصرع دوم کے ان بنیادی الفاظ کے پیش نظر فوراً لفظ نرگس ان کے ذہن میں آیا ہوگا جو بالکل سامنے کا لفظ ہے اور اس طرح یہ مصرع طیار ہو گیا۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

لیکن افسوس ہے کہ شاعر نے یہ غور نہیں کیا کہ ہر چند دونوں مصرعے لفظاً اپنی اپنی جگہ بہت خوبصورت ہیں مگر معنوی حیثیت سے ان دونوں میں کوئی ربط نہیں۔

دوسرے مصرع میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس لئے پہلے مصرع میں اسی کا ثبوت پیش کرنا چاہئے تھا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کیونکہ نرگس کی بے نوری تو ظاہر ہے، لیکن اس کی "دیدہ وری" کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اگر نرگس ہزاروں کیا لاکھوں سال بھی اپنی بے نوری پہ روئے تو بھی وہ دیدہ ور نہیں ہو سکتی۔

اب آیئے غور کریں کہ اس شعر کے کوئی اور معنی بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر دوسرے مصرع میں "بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے" کا یہ مفہوم قرار دیا جائے کہ "پیدا نہیں ہوتا"، تو وہ باتیں اس قرینہ کے خلاف ہیں۔ ایک یہ کہ یہ شعر نظم "طلوعِ اسلام" کے دوسرے بند کا ہے اور بنیادی خیال اس نظم کا یہ ہے کہ قومیں سخت ابتلا و آزمائش کے بعد ہی اُبھرتی ہیں۔ اس لئے اگر دوسرے مصرع کا مفہوم یہ لیا جائے کہ :-

"چمن میں دیدہ ور پیدا نہیں ہوتا" تو ایسا کہنا نظم کے اصل مقصد اور اقبال کے نظریہ کے خلاف ہوگا

دوسری بات یہ کہ مصرع میں "روتی ہے" کی جگہ "روئی" یا "روئی ہے" ہوتا ـــ اس شعر کو مہمل کہنا یا محض شاعرانہ اُپج قرار دینا، دونوں ایک ہی بات ہیں۔ کیونکہ حقائق کے خلاف شاعرانہ اُپج کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ایک مشہور فارسی قطعہ کا شعر ہے ؎

عمرہا باید کہ تا یک مرد صاحبدل شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

اقبال کا مقصد بھی اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں اسی نظریہ کو پیش کرنا تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ نظم پوری کی پوری اس لحاظ سے بڑی یکسانیت رکھتی ہے، لیکن "نرگس والے" شعر میں ان کی نگاہ چوک گئی، اور شعر کے لفظی حُسن نے انھیں معنی کی طرف غور کرنے کا موقع نہیں دیا اگر پہلے مصرع کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا ؎

خدا معلوم کیونکر چشمِ نرگس دیدہ ور ہوئی ہوگی

تو دونوں مصرعوں میں ربط پیدا ہو جاتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

برادرم - وعلیکم السلام - شعر مجھے تو مہمل بالکل ہی نظر نہ آیا، اور نہ کوئی وجہ اشکال سمجھ میں آئی — مطلب بالکل صاف و واضح ہے، نہ کوئی لفظ مشکل نہ کوئی ترکیب پیچیدہ — اگر اشکال کچھ لکھ کر آتا تو شاید مزید غور کر سکتا۔ والسلام

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

محب محترم - سلام اخلاص التیام — آپ نے جس شعر کا ذکر کیا ہے، یہ بھی مہمل نہیں، بلکہ اس میں حقیقت کا بلیغ بیان ہے البتہ اس میں کچھ ابہام اور مغالطہ ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں دیدہ ور کا وجود نادر ہے۔ نرگس ہزاروں برس سے اپنی بے نوری پہ رو رہی ہے، پھر بھی اس کو دیدہ ور ہونے کی توفیق نہیں ملی۔ سبب یہ کہ دیدہ وری ایک عطیۂ ایزدی ہے محض آرزو یا کوشش سے یہ چیز میسر نہیں آتی ... اس شعر میں مغالطہ یہ ہے کہ عام طور سے شعر کے مصرعۂ ثانی کو مصرعۂ اول کا نتیجہ یا معلول سمجھ لیا جاتا ہے، یعنی نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے، آخر کار اس رونے کے نتیجے کے طور پر اس کو دیدہ وری مل جاتی ہے —! میرے نزدیک شعر میں ایک ذرا سا جملہ مقدر ہے، اور وہ یہ کہ نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے، مگر پھر بھی اس کی بے نوری نہیں جاتی — کیونکہ چمن میں دیدہ ور ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ جب تک اپنے پاس سے مہیا نہ کئے جائیں مضمون مکمل نہیں ہوتا۔

یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ فارسی استعارے میں نرگس کو کور مانا گیا ہے، نرگس کی یہ کوری ازل سے ابد تک وابستہ رہے گی - اسی ازلی ابدی کوری پر شعر کا مضمون استوار ہوا ہے، اگر اس کا کوئی اور معنی کیا جائے، تو شعر کے دونوں مصرعوں میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے - اور شاید اسی تضاد کو دیکھ کر بعض لوگ اس شعر کو مہمل کہہ دیتے ہیں -

ڈاکٹر محمد باقر

فاضل ارجمند قبلہ شورش صاحب - سلام مسنون — میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے اور ضروری نہیں کہ یہ درست ہو کہ شاعر کہنا چاہتا تھا کہ نرگس ہزاروں سال سے اپنی بے نوری پر ماتم کناں ہے، لیکن اُسے نور عطا نہیں ہوتا، اور اُسے دیدہ وری نصیب نہیں ہوتی لیکن اگر شعر کا یہ مفہوم قرار دیا جائے تو اس کے متن میں اُس سے کا اضافہ کرنا پڑے گا جو متن میں کہیں نہیں۔ پھر یہ کیسے اور کہاں سے آئے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب میرے پاس نہیں۔

بظاہر نرگس کے رونے اور دیدہ ور کے پیدا ہونے میں کوئی ربط نہیں۔ کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو نرگس نے ہزاروں سال رو رو کر کوئی ایک آدھ دیدہ ور تو پیدا کر کے دکھایا ہوتا۔

محترم غلام احمد پرویز

گرامی نامہ ملا، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس شعر کے مضمون میں تو کوئی غلطی نہیں۔ لیکن اس کے اظہار میں ایک ایسا سقم ہے جس کی وجہ سے یہ شعر مبہم بلکہ بے معنی سا نظر آنے لگتا ہے۔ میرے خیال میں علامہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نرگس کی آنکھ تو ہے، لیکن اس میں بینائی نہیں، اور وہ اپنی اس بے نوری پر عمر بھر روتی رہتی ہے — شعر کے موجودہ اسلوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری کا ماتم کرتی رہتی ہے — جب کہیں جا کر چمن میں ایک دیدہ ور پیدا ہوتا ہے اور یہ مفہوم بے معنی ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک

مکرمی آغا جان - اسلام علیکم - اشعار کی چیر پھاڑ کا مشغلہ مجھے کبھی پسند نہ تھا: اب ہے، اگر کوئی شعر شاعر کے مفہوم یا جذبے کو واضح کر دیتا ہے اور سامع اس سے متاثر ہو جاتا ہے تو یہ کافی ہے۔ "ترکیب نحوی" کی کیا ضرورت ہے ؟

بظاہر علامہ کے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ "نرگس ہزاروں سال تک اس پر روتی ہے کہ وہ (بظاہر آنکھ کی ہمشکل ہونے کے باوجود) بے نور ہے۔ جب کہیں جا کر چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے، جو نور بصیرت و بصارت سے مالا مال ہوتا ہے۔

اب اس کو "مہمل" کہئے یا "شاعرانہ اپج" قرار دیجئے۔ بہر حال مطلب اس سے زیادہ نہیں، جو بیان کیا جا چکا۔ اور حضرت علامہ کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار مل جائیں گے، جو نہایت حسین و موثر ہیں، لیکن چیر پھاڑ کے متحمل نہیں۔ بفحوائے شعرم را بدرسہ کہ برد۔

مولانا غلام رسول مہر

مکرمی - مجھے تو اس شعر میں کسی پیچیدگی کا احساس آج تک نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ میری کم فہمی کا کرشمہ ہو۔ بہ ظاہر شعر کا مطلب یہی ہے کہ نرگس کو اگرچہ قدرت نے آنکھ کی شکل عطا کی ہے اور سب اُسے آنکھ ہی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تاہم بے نور ہے، بے بصیرت ہے، بے بصارت ہے اور دیدہ وری اور بصیرت کا رتبہ بہ آسانی میسر نہیں آتا ہے، بلکہ بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔

اب پورے شعر کو استعارہ فرض کرتے ہوئے اسے عالم انسانیت پر استعمال کریں۔ لاکھوں کروڑوں آنکھیں موجود ہیں اور روزانہ آنکھوں والے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر دیدہ وری اور بصیرت کی متاع گراں ارزاں سب کو نہیں ملتی۔ بلکہ انتہائی مشکلات کے بعد کوئی ایک ایسا پیدا ہوتا ہے، جس کی آنکھ حقیقت بیں نظر سے بہرہ مند ہو اور وہ دور تک دیکھ سکے۔ مگر جو اسلوب بیان اقبال نے اختیار کیا ہے میرے فہم کے مطابق اس میں حسن و دلآویزی کے خاص پہلو موجود ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ میں نے اپنے ناچیز فہم کی کیفیت پیش کر دی۔

(نگار) جناب آغا شورش کاشمیری، اڈیٹر چٹان نے اقبال کے اس شعر پر مختلف اہل بصیرت کی رائیں حاصل کر کے، بڑی دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے اور اکثر حضرات نے تاویل سے کام لے کر اس شعر کو با معنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ——— اور تاویل کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ یہ شعر اقبال کا ہے اور اس کی بنیاد محض اس مفروضہ یا حسن ظن پر قایم ہے کہ اقبال کے کلام میں کسی غلطی یا تسامح کا پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس مرعوبیت سے ہٹ کر محض فنی حیثیت سے غور کیا جاتا تو شعر کے دونوں مصرعوں کا ایک دوسرے سے غیر مربوط ہونا، ایسی غیر واضح چیز نہیں کہ اس پر زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہوتی۔

اصل چیز غور کرنے کی یہ ہے کہ اقبال کا معہود ذہنی کیا تھا اور وہ در اصل کیا کہنا چاہتے تھے، کیونکہ جب تک یہ امر متحقق نہ ہو جائے، اس شعر کی صحت یا اس کے سقم پر اظہار رائے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں مصرع ثانی پر غور کرنا چاہئے، کیونکہ دعویٰ اسی مصرع میں کیا گیا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ :- بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب آیئے سب سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ "بڑی مشکل" کہکر شاعر کیا ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ دیدہ ور پیدا ہی نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ دیدہ ور پیدا ہوتا ہے لیکن بہت مشکل سے "بڑی دشواریوں" کے بعد۔

اس پر کوئی قطعی رائے دینے سے پہلے ضروری ہے کہ اُس نظم یا اُس بند کو سامنے رکھا جائے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے، کیونکہ بغیر اس کے شاعر کا معہود ذہنی واضح نہیں ہو سکتا ——— یہ شعر نظم "طلوع اسلام" کا ہے جس میں مسلم قوم سے خطاب کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ قوم کو اُبھارنے والی تین چیزیں ہیں :- "یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" ——— اور انھیں کی بنیاد پر اقوام و ملل کی حیات و ترقی کا انحصار ہے ——— اب اس بند کو لیجئے جس میں زیر بحث شعر بھی شامل ہے :-

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں پھر ہوں گے گہر پیدا
کتاب ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینہ میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہدے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہدے

اس بند میں صرف یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ اصل چیز سعی و عمل ہے اور وہی تنہا ذریعہ حصولِ مدعا کا ہے۔

اب اس حقیقت کے پیشِ نظر غور کیجئے کہ "بڑی مشکل" سے مراد اقبال کی کیا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مصرع سے مراد ان کی یہ نہیں ہو سکتی کہ "چمن میں دیدہ ور پیدا نہیں ہو سکتا" کیونکہ یہ مفہوم اقبال کی تعلیم، نظم کی غایت اور بند کے سیاقی و سباقی اشعار کے منافی ہوگا۔ بلکہ ان کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ چمن میں دیدہ ور یقیناً پیدا ہو سکتا ہے اگر ان مشکلات کو جھیل لیا جائے جو اس راہ میں عموماً حایل ہوا کرتی ہیں۔

اس طرح یہ بات تو طے ہو گئی کہ اقبال نے اس جگہ نرگس کو دیدہ ور ظاہر کیا ہے۔ اب آیئے اس پر غور کریں کہ پہلا مصرع اس کا موید ہے یا نہیں۔

اس مفہوم کے پیشِ نظر مصرع اول میں صرف ایک فقرہ "روتی ہے" بے محل ہے۔ اگر اس کی جگہ "روئی ہے" پڑھا جائے تو پھر کوئی نقص باقی نہیں رہتا۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ایک جملہ مقدر مان کر جو مفہوم متعین کیا ہے، اس کی بنیاد صرف اس خیال پر قایم ہے کہ فارسی استعارہ میں نرگس کو ہمیشہ کور مانا گیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ فارسی شاعری میں کنایتاً "چشمِ محبوب" کو نرگس کہتے ہیں اور اسکی صفات میں طناز، فتاں، کرشمہ ساز، عشوہ طراز، مست و بیمار، خدا جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، بعض شعراء نے اسے چشمِ محبوب سے مقابلہ کرتے ہوئے طنزاً کو بھی ظاہر کیا ہے، لیکن زیادہ تر جن صفات کے ساتھ اسے متصف کیا جاتا ہے وہ کوری کے خلاف ہیں، بلکہ بعض شعراء نے تو اس کی غیر معمولی روشنی کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ خود اندھا اس سے کسب نور کر سکتا ہے۔

مثلاً میر محمد افضل ثابت کا یہ شعر ملاحظہ ہو:-

کور از روشنی مشعلِ نرگس بیند — ہر چہ در خاطرِ مورے گزرد در شبِ تار

بہرحال یہ خیال کرنا کہ نرگس کو ہمیشہ کور ہی قرار دیا گیا ہے اور اقبال نے بھی اس کو کور ہی مان کر یہ شعر کہا ہے، صحیح نہیں۔ اقبال نے یقیناً اس شعر میں نرگس کو کور نہیں بلکہ دیدہ ور قرار دیا ہے، اور اس کی "دیدہ وری" کو سالہا سال کی اشکباری کا نتیجہ بتایا ہے کیونکہ موجودہ صورت تک پہونچنے کے لئے یقیناً اس کو بہت سی ارتقائی منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔

لیکن اس مفہوم کے پیشِ نظر "روتی ہے" کہنا البتہ ضرور بے محل ہے "روئی ہے" ہونا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ اقبال نے یہی لکھا ہو اور بعد کو سہو کتابت سے روئی کا ہمزہ دو نقطوں میں تبدیل ہو گیا ہو۔

انھیں تمام اُلجھنوں کو دور کرنے کے لئے میں نے یہ مصرع تجویز کیا تھا کہ:-

"بڑی دشواریوں سے چشمِ نرگس دار ہوئی ہوگی" - یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے — "پس از یک عمر گریہ چشمِ نرگس دار ہوئی ہوگی"

انتخاب زنداں نامہ

(فیض احمد فیض)

تیرے دست ستم کا عجز نہیں — دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی،

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ — جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر — کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے — سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے — رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی،

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے — ہم اُن سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم — وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں،

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے — چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی — تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں — جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ہاں جاں کے زیاں کی ہمکو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے — ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں — دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

انھیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے — جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

صبح کی طرح جھمکتا ہے شب غم کا افق — فیض تابندگی دیدۂ تر تو دیکھو

(ادیب سہارنپوری)

چڑھ گئے جب سے نظر میں اک سراپا ناز کے
سیکڑوں نغمے سنے ہم نے بغیر آواز کے

جتنی جتنی نغمہ گر کی تشنگی بڑھتی گئی
فاصلے گھٹتے گئے آواز سے آواز کے

نام اس کا پوچھتے ہیں اہلِ دنیا اے ادیب
عمر بھر جس کو پکارا ہے بغیر آواز کے

گردشِ دو عالم سے لڑ رہے ہیں ہم تنہا،
شاید اس خرابے میں ہوں گے ہم سے کم تنہا

ہنس رہے ہیں مری باتوں پہ زمانے والے
اور چپ ہیں مجھے دیوانہ بنانے والے

ہم غریبوں پہ بتوں نے بھی خدائی کر لی
آفریں ہے تجھے آئینہ بنانے والے

نئی قدریں - نئے معیار - کیا معلوم کیا ہوگا
نشانِ امن ہے تلوار کیا معلوم کیا ہوگا

پہونچ گئی ہے کہاں غم میں شدتِ احساس
کوئی ہنسا ہے تو ہم ہو گئے ہیں اور اُداس

گئے تھے شکوہ سرائی کو لیکن انکے حضور
زباں سے کچھ بھی نہ نکلا سوائے شکر و سپاس

چشمِ ساقی سے زندگی بھر پی
تشنگی ہے مگر وہی کی وہی

چلی پھر نکہتِ بادِ بہاری
خلش بننے لگی پرہیز گاری

ہماری اور گلوں کی زندگی کیا
کسی پر دن کسی پر رات بھاری

وفاؤں کی بڑھا دیتی ہے عمریں
وفاؤں پر تری بے اعتباری

کچھ اس انداز سے دیکھا کسی نے
کہ ہو کر رہ گئے گم - ناگہاں ہم

پھریرے امن کے لہرانے والو
لہو تو اپنے دامن سے چھڑا لو

غمِ ہستی اگر اُٹھتا نہیں ہے
تو مے چھلکاؤ - پیمانے اُٹھا لو

ادیب ایمان ہو جائے گا تازہ
کسی کافر سے تم بھی دل لگا لو

فقیہِ شہر نہ پیرِ حرم کی بات چلی
جدھر چلے وہ اُدھر ساری کائنات چلی

کیفی چریاکوٹی مرحوم)

جھکا کے پھر نہ سرِ بندگی اُٹھانا تھا — کسی کی بندہ نوازی کو آزمانا تھا
سرِ نیاز حرم میں جھکا دیا میں نے — اسی پہ بارِ دو عالم مجھے اُٹھانا تھا
سکوت کفر ہے اس بزمِ زندگانی میں، — بجھی تھی شمع تو خونِ جگر جلانا تھا
چھڑی ہوئی تھی جہاں بحث کفر و ایماں کی — نظر بدل کے وہیں تم کو مسکرانا تھا!
میں لطفِ وعدۂ کوثر کی اس ادا پہ نثار — کہ بھر کے جام مجھے دور سے دکھانا تھا

امید عیش تھی کیفی وہ چھوڑ دی میں نے
دلِ خراب سے اس کو مجھے بچانا تھا

شفقت کاظمی)

دیتا رہا فریبِ وفا اس طرح کوئی — جیسے مجھے مآلِ وفا کی خبر نہ تھی
ہر چند تیرے قرب کی دولت نہ پا سکے — لیکن ترے بغیر بھی اپنی گزر گئی
چھائی ہیں اور لالہ و گل پر اُداسیاں — آئی ہے یوں بھی فصلِ بہاراں کبھی کبھی
اہلِ محفل کی دلچسپیاں ہیں وہی — کب سے دُہرا رہا ہوں فسانہ ترا
میری بربادیوں کا سبب کچھ سہی — نام لیتا ہے لیکن زمانہ ترا
مجھ کو اب تک ٹھکانا میسر نہیں — جانے چھوٹا تھا کب آستانہ ترا

سو گئی بزم کی بزم اے کاظمی
کوئی سنتا کہاں تک فسانہ ترا

(سعادت نظیر)

بہارِ خونِ تمنا میں ڈوب کر آئی
کچھ اور لالہ و گل کی فضا نکھر آئی،

نظر کے سامنے جب اُن کی رہگزر آئی
تو ہر قدم پہ نئی زندگی نظر آئی

اب اعتبارِ نظر اس سے بڑھ کے کیا ہوگا!
ملیں نگاہیں تو سمجھا، "امید بر آئی"

شکستِ شیشۂ دل کا ہمیں خیال آیا
جو درد میں کوئی آواز ڈوب کر آئی

فریبِ حُسن میں آئے، تو یہ ہوا معلوم
جہاں میں ایک یہی زیست کا بہانہ تھا

بس اتنا یاد ہے مجھ کو کہ برق چمکی تھی
پھر اس کے بعد چمن تھا نہ آشیانہ تھا

کلی کلی میں سمٹ کر بہار آجاتی
کبھی تو اُن کو گلستاں میں مسکرانا تھا

نزاکتیں ہیں محبت کی درمیاں، ورنہ
ابھی کچھ اور مجھے دردِ دل سُنانا تھا

رُباعیاں

(شفیق مینائی)

جب انجمنِ ناز میں آیا ساقی
ہر شے پہ بہار بن کے چھایا ساقی

پوچھا میں نے جو اس سے مقصودِ حیات
ساغر چھلکا کے مسکرایا ساقی

جھیلا جو تصادمِ زمانہ ہم نے
پائی روحِ مجاہدانہ ہم نے

دل ٹوٹا تو ہمت ہوئی کچھ اور بلند
کھائی ہے شکست فاتحانہ ہم نے

بے باک زمانہ کی سیاست نہ رہی
پہلی سی وہ بے لوث محبت نہ رہی

اس دورِ ترقی کا تنزل دیکھو
افسانے تو رہ گئے حقیقت نہ رہی

اُن کا خط

(رعنا بلسوی)

اے مرے رعنا، مرے باغ تمنا کی بہار
چاہتی تھی میں بنو تم میری دنیا کی بہار

لیکن اب یہ آرزو اک خواب بے تعبیر ہے — عمر بھر کھٹکا کرے گا دل میں یہ وہ تیر ہے
شوق نغمہ اب کسے ہے اب کہاں بزم نشاط — فرش شعلوں کا نظر آتی ہے پھولوں کی بساط
خواب میں بھی اب نہ دیکھو گے مجھے گاتے ہوئے — اپنے پاس آتے ہوئے اور پھول برساتے ہوئے

کفر ساماں کہاں، میں فتنہ ساماں بھی نہیں
شمع صحرا بھی نہیں، شمع شبستاں بھی نہیں

پھول ہوں، لیکن نگاہوں کو نہیں دیتی فریب — میں نہیں لیتی کسی کے ہاتھ سے جام شکیب
مجھ پہ للچائی نگاہوں کا نہیں ہوتا اثر — میں نہیں دیتی کسی کو دعوتِ ذوقِ نظر
کیا خبر ہے جانے کب موسم لگا دے گھر میں آگ — سوز ہے دل میں مرے یا شیشہ و ساغر میں آگ

شوق آرائش برائے دعوتِ جلوہ نہیں
جتنی تم سمجھے ہو میں اتنی بھی بے پردہ نہیں

کیا بتاؤں آئینہ ہاتھوں سے کیوں چھٹتا نہیں — جانِ رعنا ہوں مگر اب "جلوۂ رعنا" نہیں
دیکھتی یہ ہوں کہ پلکوں پر کوئی آنسو نہ ہو — میری نظروں سے برستا شوقِ رنگ و بو نہ ہو

میرا جلوہ دیکھنے کا آئینہ تم لے گئے
ٹوٹنے کو صرف اک نازک سا شیشہ دے گئے

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات - تقطیع بڑی - قیمت سات روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- کتابستان - الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے۔ آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُن کے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی شامل ہیں۔

اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

مطبوعات موصولہ

دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) اس سے قبل ہماری کوشش صرف یہ ہوتی تھی کہ غالب کا کلام سمجھیں اور اس سے بحث نہ ہوتی تھی کہ غالب نے اپنا دیوان کب مرتب کیا اور عام متداول دیوان کے علاوہ بھی اس کا کلام کچھ اور ہے یا نہیں جاتا ہے یا نہیں۔ اسی لئے اول اول دیوان غالب کی شرحیں تو متعدد لکھی گئیں، لیکن ریسرچ کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اس سلسلہ میں اب سے تقریباً ۴۰ سال قبل اول اول ڈاکٹر بجنوری مرحوم کو بھوپال کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ دیوان غالب کا ہاتھ آیا جس میں منتخب و غیر منتخب کلام سب کا سب شامل تھا۔ انھوں نے اس پر ایک بسیط مقدمہ لکھا اور نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شایع کیا۔ یہ تھی ابتدا غالب پر ریسرچ کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف نے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے کلام غالب کو جمع کرنا چاہا لیکن یہ کام ادھورا رہ گیا۔ یہی کوشش اکرام نے بھی کی لیکن وہ بھی پوری نہ ہوئی، اخیر میں مالک رام نے نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب شامل کرکے ایک اچھا اڈیشن شایع کیا۔ لیکن اب تک کوئی ایسا اڈیشن شایع نہ ہوا تھا جو غالب کا سارا کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیتا۔

اس کمی یا ضرورت کو ہمارے مشہور محقق مولانا امتیاز علی عرشی نے پورا کر دیا۔ یہ نسخہ انھوں نے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے عالمانہ تحقیق کا پورا حق کر دیا ہے۔ مولانا عرشی عرصہ سے غالب پر کام کر رہے ہیں اور اس سے قبل وہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نسخہ ریسرچ کے جدید اصول کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور ہر لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے اس کو بڑے سایز کے ولایتی کاغذ پر نہایت اہتمام سے ٹائپ کے حروف میں جلد شایع کیا ہے۔ یہ نسخہ ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے اور بہتیس روپیہ میں انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے مل سکتا ہے۔

مرقع غالب غالب پر اس وقت تک خدا جانے کیا کیا اور کتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن مرقع غالب اس سلسلہ کی بالکل نئی چیز ہے۔ اس میں جناب خیر بہوروی نے غالب کی تمام وہ تصویریں (رنگین و سادہ) جو اس وقت تک مختلف کتابوں اور رسالوں میں شایع ہو چکی ہیں یکجا کر دی ہیں اور بعض مشہور نقادانِ غالب کی رائے بھی اس میں شامل کر دی گئی ہے۔ یہ مرقع دراصل غالب انسائکلوپیڈیا کا افتتاحی باب ہے جس کی ترتیب میں جناب خیر بہوروی عرصہ سے مصروف ہیں۔

یہ مرقع نہایت نفیس آرٹ پیپر پر مجلد شایع کیا گیا ہے اور جناب خیر بہوروی — بہورو (بلیا) سے مل سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد حکومتِ ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات نے ایک مجموعۂ مضامین اس نام سے شایع کیا ہے، جس میں ملک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے مولانا مرحوم کی علمی و صحافتی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ غالباً ابھی ختم نہ ہوگا، کیونکہ ان کی علمی و عملی زندگی اس قدر وسیع و متنوع تھی کہ بیک وقت ان سب کا احاطہ آسان نہیں اور بہت آہستہ آہستہ یہ پردے اٹھیں گے۔

ہوسکتا ہے کہ محکمۂ اطلاعات کی اس کوشش کو محض رسمی چیز خیال کیا جائے۔ تاہم وہ اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتی ہے اور بعض ایسے حضرات کے خیالات کی حامل ہے، جو مولانا سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتے تھے۔

کتاب نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کی گئی ہے اور پبلی کیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔

طوفان وساحل

موجودہ عہد کے اُردو شاعروں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے نام سے تو ہم آشنا ہیں لیکن ان کے کام سے پوری طرح واقف نہیں، انھیں میں ایک جناب قیصر امراوتوی بھی ہیں۔ قیصر صاحب پُرانے شاعر ہیں، کہنہ مشقی اور شعر دونوں حیثیتوں سے جرائد و رسایل کی دنیا میں بھی وہ غیر معروف نہیں ہیں، لیکن دراصل وہ ہیں کیا اور کس مرتبہ کے شاعر، اس کا علم اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

وہ نظم و غزل دونوں خوب لکھتے ہیں۔ نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ تغزل سے خالی نہیں اور غزلوں کی خوبی یہ کہ وہ محض تقلید و تتبع نہیں۔ وہ نہ ماضی کے سوگوار ہیں، نہ مستقبل کے واعظ و مبلغ بلکہ حال کے شاعر ہیں اور جو ان پر گزرتی ہے اس کو وہ بڑی لطافت و ندرت سے ظاہر کر دیتے ہیں۔

بہ سلسلۂ تعارف جناب رشید کیفی نے، قیصر کی شاعری پر بڑی بسیط گفتگو کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کلام قیصر کا نقد و تجزیہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا اور جو اشعار بہ سلسلۂ گفتگو انھوں نے منتخب کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود جناب رشید کیفی کتنے اچھے سخن فہم ہیں (ممکن ہے سخن گو بھی ہوں)۔

ان کی پسند کے چند اشعارِ غزل ملاحظہ ہوں :-

فسانۂ دلِ پرشوق پوچھنے والو — یہ داستاں بھی کسی کو سنائی جاتی ہے
غضب خدا کا یہ مجبوریاں محبت کی — دُعا کو ہاتھ اُٹھائے تو لب ہلا نہ سکے
قیصر ہجومِ شوق میں اکثر گماں ہوا — جیسے گزر گئے وہ ہمارے قریب سے
یہ جنونِ سجدہ، یہ شوقِ دل، ذرا آزما کے تو دیکھ لوں — مرے حوصلوں سے بلند ہے ترا آستاں تو ہوا کرے
نسیم کچھ تو بتا کہ آخر چمن میں کس بات کی کمی تھی — بہار آتے ہی ذکر میرا گلوں میں کیوں بار بار آیا
بیٹھے ہوئے ہیں ناخنِ تدبیر توڑ کر — اب کوئی عقدہ، عقدۂ مشکل نہیں رہا

جو شاعر ایسے شعر کہہ سکتا ہے، اسے حق حاصل ہے کہ وہ بہ جبر ہر شخص سے خراجِ تحسین وصول کرے۔

قیصر کا کلام بڑا ہموار ہے اور اگر اس میں تسامح پایا بھی جاتا ہے تو خال خال، مثلاً اس شعر میں :

وفورِ سجدہ نے کعبے بنا دئے لاکھوں — اب آپ بیٹھے رہیں لے کے آستاں اپنا

"لے کے آستاں بیٹھے رہیں" خلاف محاورہ ہے۔ "آستاں لئے بیٹھے رہیں" ہونا چاہئے۔

یہ مجموعہ بہت اچھے کاغذ پر مجلد شایع ہوا ہے اور تین روپیہ میں آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سے مل سکتا ہے۔

"ابوالکلام آزاد"

اگست ۵۸ء میں "آجکل" کا "ابوالکلام نمبر" شایع کیا گیا تھا۔ اسکی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ شایع ہوتے ہی ساری کاپیاں ختم ہوگئیں اور ہم شائقین کی فرمایش پوری نہ کرسکے۔ اب اہل ذوق حضرات کی فرمایش پر اس نمبر کو بعض ترمیمات کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی انکی علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی خدمات کے بارے میں انکے رفقا اور مشہور اہل قلم حضرات کے مضامین شامل ہیں جن سے مولانا آزاد کی متنوع شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

ضخامت ۲۲۴ مع تصاویر۔ قیمت دو روپیہ۔ ڈاک خرچ ۴۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکریٹریٹ۔ دہلی۔ ۸

رنگ برنگ ریاست مدراس کے نمایندہ شعراء کی غزلوں کا انتخاب ہے جسے مرکز ادب مدراس نے شایع کیا ہے۔
صوبۂ مدراس میں ہمیشہ اُردو سے کافی دلچسپی لی گئی ہے اور اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد وہاں کی ادبی رفتار کچھ کم ہوگئی تھی، لیکن آزادی ہند کے بعد وہاں کا ذوقِ ادب پھر آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہے۔ اور متعدد ادارے زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔

یہ انتخاب تمام شعراء مدراس کے کلام کا نہیں ہے بلکہ صرف تیرہ شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے، جن میں سے بعض کافی آگے بڑھ چکے ہیں اور بعض آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ان سب کا کلام زبان و اندازِ بیان کے لحاظ سے اس درجہ پاکیزہ ہے کہ شمالی اور جنوبی ہند کی شاعری کے درمیان ہم کوئی خط فاصل نہیں کھینچ سکتے۔

یہ کتاب تاج بک ڈپو مسجد بڑی میٹ مدراس سے بہ ہیں مل سکتی ہے۔

اسکالر سرسید ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ماہنامہ "اسکالر" کا پیروڈی نمبر ہے۔ کسی کے انداز تحریر کی ظریفانہ نقل کرنا اس کا اُڑانا پیروڈی کہلاتا ہے۔ اور اس خصوصی نمبر کے تمام مضامین نظم و نثر اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔

اس رسالہ کی ایک مجلس مشورت بھی ہے جس میں پروفیسر سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر محمد حسن کا نام بھی نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس رسالہ کو ایسے مسلم الثبوت ادیبوں و نقادوں کا مشورہ حاصل ہے، اسے اچھا ہونا ہی چاہئے۔

پیروڈی کے بارہ میں پروفیسر سرور کا پیش لفظ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ارشادات کے علاوہ اور جن حضرات نے اس نمبر کی تحریر و ترتیب میں حصہ لیا ہے ان میں پروفیسر ذوقی، ڈاکٹر قمر رئیس، شکیب اور خود اس رسالہ کے اڈیٹر احمد جمال پاشا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ——— قیمت دو روپیہ ہے۔

تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کے مخطوطات کی یہ چوتھی جلد ہے جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے عربی، فارسی، اُردو اور ہندی مخطوطات کی اجمالی فہرست دی گئی ہے اور اس کے بعد موضوع کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں تقریباً ۸۰۰ اُردو، ۳۰۰ فارسی، ۵۱ عربی اور ۱۲ ہندی مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے اور ایسی تفصیل کے ساتھ کہ مخطوطات کی تمام حیثیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

یہ ادارہ عرصہ سے بڑی اہم ادبی خدمات انجام دے رہا ہے اور قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر زور جنھوں نے اس ادارہ کی بنیاد رکھی اور رفتہ رفتہ نادر کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ فراہم کر لیا۔

یہ تذکرہ بڑے سایز پر نہایت اہتمام سے شایع کیا گیا ہے اور سب رس کتاب گھر، خیریت آباد حیدرآباد سے مل سکتا ہے قیمت درج نہیں ہے

پنڈت نہرو سے بات چیت

از ٹیبر منڈی

مسٹر ٹیبر منڈی پریس میں سیاسیات کے استاد ہیں اور اس دور کے سیاسی اور سماجی مسایل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے دسمبر ۱۹۵۵ء اور جنوری ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصہ میں حالات حاضرہ پر بات چیت کی تھی اس بات چیت میں پنڈت نہرو نے بہت سے ملکی اور بین الاقوامی مسایل پر روشنی ڈالی ہے چونکہ یہ بات چیت بے تکلف گفتگو کے انداز میں ہے، اس سے پنڈت نہرو کی شخصیت کے بعض بڑے دلچسپ پہلو سامنے آئے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا یہ بات چیت انگریزی میں کتابی صورت میں شایع ہوئی تھی۔ جناب سعادت علی خاں ایم پی نے اس کتاب کا سلیس اُردو میں ترجمہ کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اُردو داں حضرات کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔

قیمت فی کتاب دو روپے۔ ڈاک خرچ ۴۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن۔ اولڈ سیکریٹریٹ۔ دہلی۔ ۸